بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ محمد اقبالؒ کا تصورِ دین و ملت

حضرت مولانا ابو عمار
زاہد الراشدی

— ناشر —

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : علامہ محمد اقبالؒ کا تصورِ دین وملّت
تالیف : مولانا ابو عمار زاہد الراشدی
مرتب : ناصر الدین خان عامر
مجموعہ : مئی ۲۰۲۴ء
ناشر :
اشاعت :

﴿فہرست﴾

☆ پیش لفظ..7
☆ عرضِ ناشر..8

علمی وفکری رُجحانات

☆ علامہ محمد اقبالؒ اور تجدد پسندی..10
☆ علامہ محمد اقبالؒ اور پارلیمنٹ کے لیے تعبیرِ شریعت کا اختیار..........................15
☆ اقبالؒ کے نادان دوستوں سے!..18
☆ علامہ اقبالؒ کے نام پر گمراہ کُن خیالات 20
☆ علامہ محمد اقبالؒ اور سردار محمد عبدالقیوم خان 22
☆ اسلام کی تشریح اور علامہ محمد اقبالؒ: پیپلز پارٹی کا نقطۂ نظر..........................23
☆ اقبالؒ کے نام پر فتنہ خیزی!..25
☆ شریعت بل، پارلیمنٹ کی خود مختاری اور اجتہاد..26
☆ شریعت کی تعبیر وتشریح اور علامہ محمد اقبالؒ..35
☆ اجتہاد کی اہلیت کا مسئلہ..42
☆ ڈاکٹر صدیقی صاحب کا مضمون: ایک خدشہ..44
☆ اقبالؒ کا تصورِ اجتہاد..46
☆ ”خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں“ 53
☆ جدید سیاسی نظام اور اجتہاد..55
☆ ترکی میں احادیث کی نئی تعبیر وتشریح..66

☆ اسلامی شریعت کی تعبیر و تشریح: علمی و فکری سوالات 68
☆ شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات اور فکرِ اقبالؒ 74
☆ علامہ محمد اقبالؒ کے فقہی اور ملّی رجحانات 77
☆ عصرِ حاضر میں اجتہاد 79
☆ پارلیمنٹ کا حقِ تعبیر و تشریح اور علماء کونسل کی تجویز 81

مسئلہ قادیانیت

☆ کشمیر کمیٹی کا دامِ ہمرنگ زمین 84
☆ مسئلہ قادیانیت اور دینی حلقوں کے جذبات 85
☆ علامہ محمد اقبالؒ اور مجلسِ احرارِ اسلام 87
☆ علامہ محمد اقبالؒ اور کشمیر کے بتّیس لاکھ مسلمان 90
☆ نوابزادہ نصراللہ خان اور قادیانیت 91
☆ ''پاکستان کے مذہبی اچھوت'' 92
☆ مسلمانوں اور قادیانیوں کی طرف سے تکفیر کے اعلانات 97
☆ قادیانیت: جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور علامہ محمد اقبالؒ 99
☆ قادیانیت کے بارے میں اقبالؒ کے ارشادات 100
☆ قادیانیت کے سو سال 105
☆ الطاف حسین کے مغالطے 110
☆ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعوائے نبوت 115
☆ علامہ محمد اقبالؒ اور قادیانیت: عمار خان ناصر کا موقف 117
☆ مسئلہ قادیانیت کے تین پہلو 121
☆ علامہ اقبالؒ کا وژن اور جمہور علمائے اسلام 125
☆ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تجویز 126

☆ مسئلہ قادیانیت کا پس منظر اور علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز..............................127
☆ مذاہب کا تسلسل اور ختمِ نبوت..132
☆ یہودیوں اور قادیانیوں میں مماثلت..138
☆ قادیانیوں کے ساتھ تعلقات کا سماجی دائرہ.......................................139
☆ مرتد کی سزا کی بحث اور قادیانیت..142
☆ علامہ محمد اقبالؒ کا پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب..........................145
☆ نیا نبی، اطاعت کا نیا مرکز..147
☆ اسلامی عقائد رکھنے کے باوجود قادیانی مسلمان کیوں نہیں؟.........................149

پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر

☆ "جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے"..152
☆ "اسلامی سیکولرازم" کا سبق..154
☆ صدر جنرل پرویز مشرف اور ریئل ازم..155
☆ پاکستان، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مرکز!...158
☆ علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ.......................................159
☆ "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ"..160
☆ مغربی فکر و فلسفہ کا ناقدانہ علمی جائزہ لینے کی ضرورت..........................161
☆ فاروق ستار کا مغالطہ..162
☆ "عیدِ آزاداں شکوہِ ملک ودیں"...164
☆ نظریۂ پاکستان سے بے خبری اتفاقی نہیں......................................166
☆ علامہ محمد اقبالؒ کا پاکستان..167
☆ قیامِ پاکستان کا مقصد..170
☆ "عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد"..171

☆ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی تعلیمات............173
☆ اسلام کی چھتری............175
☆ علامہ محمد اقبالؒ کا ایک خطاب............176
☆ اندلس کی تاریخ اور برصغیر کے دینی مدارس............182
☆ تحریکِ آزادی کے راہنماؤں کی جدوجہد............186
☆ مسلم تہذیب وثقافت کو بحال کرنے کا مقصد............187

متفرق تذکار

☆ اسلام اور جمہوریت کے بارے میں علامہ اقبالؒ کا کلام............189
☆ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ............190
☆ کروڑوں "ڈیانائیں"............191
☆ کامریڈ، الہلال، زمیندار اور چٹان............192
☆ فرزندِ اقبال کا دورۂ افغانستان............193
☆ "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے"............195
☆ قومیت کی بنیاد کس پر؟............197
☆ خلافت کی قبا............198
☆ آسٹریلیا مسجد لاہور............199
☆ اردو کے پیپر میں ایک افسوسناک سوال............200
☆ حج کا نظم ونسق اور فقہی ترجیحات............202
☆ اسلام اور جدیدیت کی کشمکش............204
☆ حضرت مجدد الف ثانیؒ............205

ٹوئیٹس............206

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ ہماری ملی تاریخ کی ایک نامور شخصیت ہیں جنہوں نے جنوبی ایشیا میں امتِ مسلمہ کی علمی، دینی، فکری، تہذیبی اور سیاسی دائروں میں قائدانہ راہنمائی کی اور مسلمانوں میں دینی حمیت اور ملی غیرت بالخصوص جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت کے جذبہ کو مسلمانوں کے دلوں میں اجاگر کیا۔ ان کے کسی علمی و فکری موقف سے اختلاف کی گنجائش ہے مگر اسلام کے ساتھ دوٹوک وابستگی، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت اور ملتِ اسلامیہ کی خیر خواہی اُن کے وہ امتیاز و اوصاف ہیں جو ہماری قومی تاریخ کے ایک روشن باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے بھی ایک نیاز مند کے طور پر ان کے افکار اور جدوجہد کے مطالعہ کا موقع ملا ہے اور ان کے حوالہ سے کچھ نہ کچھ عرض بھی کرتا رہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں چند مضامین کا ایک مجموعہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اسے قبولیت سے نوازیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے نفع بخش بنائیں، آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ
۱۲ جون ۲۰۲۳ء

عرضِ ناشر

علمی و فکری رُجحانات

علامہ محمد اقبالؒ اور تجدد پسندی

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۶ء)

روزنامہ نوائے وقت کی ۱۸ و ۱۹ نومبر کی اشاعت میں ’’جدید اسلامی ریاست میں تعبیرِ شریعت کا اختیار‘‘ کے عنوان سے محترم ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے علامہ محمد اقبالؒ کے حوالہ سے اس عنوان پر بحث کی ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کے لیے قانون سازی اور تعبیرِ شریعت کا دائرۂ کار اور دائرۂ اختیار کیا ہونا چاہیے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ اس کے ذریعے اس قومی بحث کو ایک واضح رخ دینے کی کوشش کی گئی ہے جو قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح، قانون سازی کے اسلامی تصور، اور پارلیمنٹ کے اختیارات وحقوق کے ضمن میں کچھ عرصہ سے جاری ہے۔ لیکن صاحبِ مضمون نے علامہ محمد اقبالؒ کی نسبت سے کچھ ایسی باتیں کہنے کی کوشش کی ہے جو اگر خود علامہ محمد اقبالؒ کی زندگی میں کہی جاتیں تو شاید ان کے رد کے لیے سب سے پہلے علامہ مرحوم ہی کا قلم حرکت میں آتا۔

علامہ محمد اقبالؒ یقیناً اس اعتبار سے ماضی قریب کے خوش قسمت ترین راہنما گزرے ہیں کہ انہیں کم وبیش تمام طبقوں سے یکساں احترام ملا ہے۔ لیکن ان کی ہمہ پہلو شخصیت کا یہ رخ بھی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے کہ ہر باطل نظریے کے علمبرداروں نے انہی کے فلسفیانہ کلام کو اپنے لیے پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے کو ترجیح دی ہے۔ مارکسی نظریات کے فروغ سے لے کر سنتِ رسولؐ کی حجیت سے انکار کے لیے علامہ محمد اقبالؒ کے کلام اور افکار کو جس بے دردی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، اور یہ ان کی شخصیت کا ایسا پہلو ہے جسے مظلومیت کے سوا اور کوئی عنوان نہیں دیا جاسکتا۔

ہمارے نزدیک یہ بھی اسی تسلسل کا حصہ ہے کہ آج علامہ محمد اقبالؒ کو ایک ایسی حیثیت سے قوم کے سامنے لایا جائے جس کا نہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی دعویٰ کیا اور نہ ہی ان کے رفقاء واعوان میں سے کسی کے حاشیۂ خیال میں آیا۔ اور پھر علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی تصویر کو اس نئی حیثیت کے

فریم میں فٹ کر کے ان سے وہ کچھ کہلوا لیا جائے جو آج کے دور میں تجدد پسندی کے پسپا ہوتے ہوئے رجحانات کو سہارا دینے کے لیے ضروری ہو۔ ایک قومی مفکر، فلسفی، شاعر اور دردمند راہنما کی حیثیت سے علامہ محمد اقبالؒ کی شخصیت ہمیشہ مسلّم اور قابلِ احترام رہی ہے۔ اور ان کا یہ کارنامہ تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے کہ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں مدت سے پرورش پانے والے جذبات کو ایک واضح سوچ اور فکر کے طور پر پیش کر کے احمد شاہ ابدالیؒ کے معرکۂ پانی پت، شہدائے بالاکوٹ کے جہادِ حریت، اور مسلمانوں کے دینی و سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے دیوبند اور علی گڑھ کی فکری و علمی جدوجہد کے تسلسل کو اس کے منطقی عروج تک پہنچا دیا۔

علامہ مرحوم نے مسلمانوں کے ملی تشخص کو اجاگر کرنے اور مسلم نوجوانوں کو جذبۂ حریت و استقلال سے سرشار کرنے کے ساتھ ساتھ یقیناً کچھ علمی مباحث پر بھی گفتگو کی ہے اور مختلف عنوانات پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن انہوں نے نہ تو خود کو کبھی امامِ اعظم ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالکؒ کی سطح پر ''مجتہدِ مطلق'' کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور نہ ہی اپنے علمی مباحث و افکار کو اپنی تجویز کردہ نئی اسلامی مملکت کی علمی اور فکری بنیاد قرار دیا ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ نے مسلمانوں کے لیے الگ ریاست پاکستان کا مطالبہ کیا تو اس ریاست کی فکری بنیاد انہی مسلمانوں کے اجماعی عقائد و رجحانات پر طے شدہ تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ علامہ محمد اقبالؒ نئی ریاست کا مطالبہ تو عام مسلمانوں کے لیے کر رہے تھے لیکن اسلام کی تعبیر و تشریح کے لیے وہ انہی مسلمانوں کے عمومی رجحانات و مسلّمات سے ہٹ کر کوئی نئی سوچ ان پر مسلط کرنے کے درپے تھے۔ اس لیے ہمارے خیال میں علامہ محمد اقبالؒ کے مضامین کے اقتباسات جوڑ کر ان میں سے مرحوم کے لیے ''مجتہدِ مطلق'' کا منصب کشید کرنا نہ صرف واقعات کے منافی ہے بلکہ خود علامہ مرحوم کے ساتھ بھی سراسر زیادتی اور نادان دوستی کے مترادف ہے۔

جہاں تک ایک قومی مفکر اور دردمند راہنما کی حیثیت سے علامہ محمد اقبالؒ کے علمی افکار ہیں ان سے یقیناً اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ اور اگر خود ان کے بقول امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے افکار و نظریات حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ کے اجتہادات حرفِ آخر نہیں ہیں، تو علامہ اقبالؒ کے اپنے اجتہادات کو بھی حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ ہی انہیں یہ حیثیت دی جا سکتی

ہے کہ انہیں روبہ عمل لانے کے لیے چودہ سو سالہ اجماعی فکری تسلسل اور ملتِ اسلامیہ کی غالب اکثریت کے اجتماعی رجحانات کی پوری بساط ہی لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی جائے۔

زیرِ نظر مضمون میں سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ علماء نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا ہے جس سے اسلام جیسے متحرک دین کو جامد مذہب میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ قطعی خلافِ واقعہ بات ہے۔ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی بات آج تک کسی نے نہیں کی، اور آج بھی ہر مسلم معاشرہ میں مفتیانِ کرام نئے پیش آمدہ مسائل کا حل اجتہاد ہی کی روشنی میں تجویز کر رہے ہیں۔ ہاں یہ بات علماء کی طرف سے ضرور کہی جا رہی ہے اور وہ بالکل منطقی اور اصولی بات ہے کہ جن مسائل میں ماضی میں اجتہادات ہو چکے ہیں اور ان اجتہادات کے اسباب وعِلل اور مقتضیات بھی جوں کے توں ہیں، ان میں محض اجتہاد کا شوق پورا کرنے کے لیے نیا اجتہاد نہ کیا جائے بلکہ ماضی کے اجتہاد کو ترجیح دی جائے۔

باقی رہے نئے پیش آمدہ مسائل یا ماضی کے وہ اجتہادات جن کے اسباب وعِلل اور مقتضیات تبدیل ہو چکے ہیں، ان میں اجتہاد سے کس نے روکا ہے؟ جہاں ضرورت ہے وہاں اجتہاد کا دروازہ آج بھی کھلا ہے، اور جہاں ضرورت نہیں ہے وہاں ہر روز نئے اجتہاد میں کوئی تک نہیں ہے۔ کسی عمارت میں ایک نیا شخص رہائش پذیر ہوا ہے تو اپنی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق ردوبدل کا اسے حق حاصل ہے، لیکن کوئی عقل مند یہ نہیں کہے گا کہ چونکہ اسے ردوبدل کا اختیار حاصل ہے اس لیے ہر چھت میں سوراخ کرنا اور ہر دیوار کو توڑنا بھی اس کا فرض بن گیا ہے۔

محترم گورایہ صاحب نے فقہی مذاہب اور مکاتبِ فکر کے الگ الگ تشخصات کو ''دورِ ملوکیت'' کی یادگار قرار دے کر اس کا حل یہ پیش فرمایا ہے کہ فقہی مسالک کے نمائندوں سے اجتہاد کا حق واپس لے کر منتخب اسمبلی کو دے دیا جائے۔ لیکن اس بات کی وضاحت نہیں فرمائی کہ صوبائی خود مختاری کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے اس دور میں اگر کسی مسئلہ پر دو صوبائی اسمبلیوں کے اجتہادات مختلف ہو گئے، اور ان اجتہادات کی بنیاد پر دو صوبوں میں الگ الگ فقہی قانون تشکیل پا کر نافذ ہو گئے، تو اس فقہی اختلاف کو وہ کس نام سے یاد کریں گے؟ اور ان دو جدا فقہی نقطۂ ہائے نظر کے پیروکاروں کے الگ الگ تشخص پر کس دور کی یادگار ہونے کی پھبتی کسیں گے؟

جناب والا! جہاں اجتہاد ہو گا وہاں اختلاف بھی ہو گا اور فطری نتیجہ کے طور پر مختلف فقہی مکاتبِ فکر تشکیل پائیں گے۔ آپ کے نئے تجویز کردہ حل سے صرف اتنا فرق پڑے گا کہ اس کے نتیجہ میں فقہی فرق حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کہلانے کی بجائے پنجابی، سندھی، بلوچستانی اور سرحدی فقہ کے پیروکار کہلائیں گے۔ اس لیے فقہی اختلاف سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ اجتہاد کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ اور ''اجتہادِ مطلق'' کو امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ تک محدود رکھنے میں حکمت کی بات یہی ہے کہ فقہی اختلافات کو جزئیات کے دائرہ میں محصور رکھا جائے، اور اجتہادِ مطلق کا دروازہ کھلا رکھنے کے شوق میں کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ چار فقہی مسالک سے چھٹکارا حاصل کرتے ہوئے چار سو نئے فقہی مسالک کی دلدل میں امت کو دھکیل دیا جائے۔

علامہ محمد اقبالؒ کے حوالہ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ نئے دور میں اجتہاد کا حق منتخب اسمبلی کو ہونا چاہیے اور اس کو یہ اختیار ہو کہ وہ حالاتِ زمانہ کی روشنی میں دین کی تعبیر وتشریح کرے۔ لیکن صاحبِ مضمون اس اہم پہلو کے بارے میں بالکل خاموش رہے ہیں کہ اسمبلی کو اجتہاد کا حق دیتے ہوئے وہ ارکانِ اسمبلی کے لیے اجتہاد کی اہلیت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ اجتہاد نام ہے قرآن وسنت کے اصولوں سے مسائل واحکام کے استنباط کا۔ اور یہ استنباط وہ استخراج وہی شخص یا ادارہ کر سکتا ہے جو قرآن وسنت سے پوری طرح واقف ہو، ان کے اصولوں سے احکام کے استنباط کے طریق کار سے آگاہ ہو، اور اس کی علمی اہلیت سے بہرہ ور ہو۔ کسی کام کی اہلیت کے بغیر کسی شخص یا ادارہ کو وہ کام سپرد کر دینا دنیا کے کسی اصول کے مطابق دانشمندی نہیں ہے۔ اور خود علامہ محمد اقبالؒ کا یہ اقتباس بھی اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو صاحبِ مضمون نے نقل کر دیا ہے:

> ''در حقیقت قرآن کی تفاسیر اور سنت کی شروح کا ذخیرہ اس کثرت سے مدون اور عام ہو چکا ہے کہ آج کے مجتہد کے پاس تعبیر شریعت کے لیے اس کی ضرورت سے بھی زیادہ مواد موجود ہے۔''

ظاہر بات ہے کہ جب آج کے مجتہد نے تعبیرِ شریعت کے لیے قرآن کی تفاسیر اور سنت کی شروح کے ذخیرہ سے استفادہ کرنا ہے تو اس استفادہ کی اہلیت سے بہرہ ور ہونا ایک ناگزیر شرط ہے جس کے بغیر مجتہد اجتہاد کا عمل مکمل نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہم بڑے ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ ہمیں

منتخب اسمبلی کو دین کی تعبیر اور اجتہاد کا حق دینے سے قطعاً کوئی انکار نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اجتہاد کا حق استعمال کرنے والی اسمبلی کی رکنیت کے لیے ''قرآن کی تفسیر اور سنت کے شروح کے ذخیرہ'' سے استفادہ کی اہلیت کو شرط قرار دے دیا جائے، اس کے بغیر اسمبلی کو اجتہاد کا حق دینا خود اجتہاد کے ساتھ سنگین مذاق ہو گا۔

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ صاحب نے روایتی سیاست دانوں کی طرح اپنے مضمون کی تان اس بات پر آ کر توڑی ہے کہ

> ''جو لوگ تحریکِ پاکستان میں علامہ محمد اقبالؒ کے خلاف سیاسی جنگ ہار گئے تھے وہ قیامِ پاکستان کے بعد تعمیرِ پاکستان سے متعلق علامہ کے افکار کو دبانے اور انہیں شکست سے دوچار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔''

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ قانون سازی اور اجتہاد کے حق کی علمی بحث کا قیامِ پاکستان کی مخالفت سے کیا تعلق ہے، کیونکہ یہ ایک فیشن بن گیا ہے کہ جب علماء کے خلاف اور کوئی بات کہنے کے لیے نہ رہ جائے تو قیامِ پاکستان کی مخالفت کے طعنے کی آڑ میں دل کی بھڑاس نکال لی جائے گی۔ لیکن اس سے قطع نظر ہم ڈاکٹر گورایہ صاحب سے یہ ضرور پوچھنا چاہیں گے کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹیؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا سیّد سلیمان ندویؒ اور ان کے ہزاروں رفقاء کو وہ کس زمرہ میں شمار کریں گے جنہوں نے نہ صرف تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا اور تحریک کی بہت سی کامیابیوں میں فیصلہ کن کردار ادا کیا؟

اور اگر بات اسی رخ پر کرنا ضروری ہے تو ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ قیامِ پاکستان کے بعد قراردادِ مقاصد اور علماء کے ۲۲ نکات کی صورت میں تعمیرِ پاکستان کی فکری بنیادیں متعیّن کرنے والے یہی علماء تھے جنہوں نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا اور علامہ محمد اقبالؒ کی تحریک کو تکمیل تک پہنچایا۔ اس لیے علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی ترجمانی میں وہ دوسروں سے زیادہ مستند حیثیت رکھتے ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ اور پارلیمنٹ کے لیے تعبیرِ شریعت کا اختیار

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ۔ ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ء)

دین کی اجماعی تعبیر جو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین کے چودہ سو سالہ تعامُل کی صورت میں چلی آرہی ہے، اس تعبیر وتشریح سے ملتِ اسلامیہ کو ہٹانے اور قرآن وسنت کو جدید تعبیر وتشریح کی سان پر چڑھانے کے لیے استعماری قوتیں اپنے آلۂ کار عناصر کے ذریعے ایک عرصہ سے مسلم معاشرہ میں سرگرمِ عمل ہیں۔ نصف صدی قبل تک بیشتر مسلم ممالک پر سامراجی قوتوں کے غلبہ واستعلا کے دور میں سامراجی آقاؤں نے مسلسل سازشوں اور محنت کے باوجود جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو دین کی بنیاد قرآن وسنت سے برگشتہ کرنا ممکن نہیں ہے تو انہوں نے اپنی حکمتِ عملی میں تبدیلی پیدا کی، اور صریح کفر کی بجائے الحاد وزندقہ کے راستہ سے مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانے کے لیے فکری فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔ ان تمام فتنوں کا بنیادی ہدف قرآن وسنت کی چودہ سو سالہ اجماعی تعبیر وتشریح اور امتِ مسلمہ کا اجماعی تعاملِ راہ ہے جس کی نفی کرنے اور مسلمانوں کو اس سے دور ہٹانے کے لیے مسلسل تگ ودو کی جارہی ہے۔

اسی فتنہ کا ایک نیا رخ مسلم ممالک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے حوالہ سے قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کے بارے میں اس عنوان سے سامنے آیا ہے کہ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کا حق علماء کے روایتی حلقوں اور اداروں کو نہیں بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں کو ہے، اور عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والی پارلیمنٹ جدید دور کے تقاضوں کی روشنی میں قرآن وسنت کی جو تعبیر کرے وہی حق ہے۔ پاکستان کے محکمہ اوقاف کے ایک ذمہ دار افسر ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کا ایک مضمون گزشتہ ماہ روزنامہ نوائے وقت لاہور اور روزنامہ جنگ لاہور دونوں میں شائع ہوا جس میں انہوں نے مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال مرحوم کی طرف منسوب کرکے اس فکر کی باقاعدہ اشاعت کا آغاز کیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم اس لحاظ سے تاریخ کی ایک مظلوم شخصیت ہیں کہ ہر باطل گروہ نے ان کے متنوع کلام میں سے اپنے مطلب کی باتیں نکال کر انہیں اپنے حق میں استعمال کیا ہے:

- اشتراکیت کے پرچار میں ان کا کلام پیش کیا گیا ہے،
- حدیثِ رسولؐ کے منکرین نے انکارِ حدیث کے لیے علامہ اقبالؒ کے کلام کا سہارا لیا ہے،
- اور اب قرآن و سنت کو چودہ سو سالہ اجماعی تعامل اور تشریح سے الگ کر کے منتخب پارلیمنٹ کے حوالہ کر دینے کی فتنہ انگیز فکر کی بنیاد بھی علامہ اقبالؒ کے بعض خطبات کو بنایا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ نے علامہ اقبالؒ کے بعض خطبات اور مضامین کے اقتباسات پیش کر کے جو فکر اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس کے اہم نکات یہ ہیں:

- علماء نے اجتہاد کا دروازہ بند کر رکھا ہے اور وہ مختلف فرقوں اور فقہوں میں بٹ گئے ہیں اس لیے ان میں اجتہاد کی اہلیت نہیں رہی۔
- جدید دور میں شریعت کی تعبیر اور اجتہاد کا حق منتخب پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔
- پارلیمنٹ کی حیثیت مجتہدِ مطلق کی ہے، وہ اجتہاد کے اس عمل میں گزشتہ دور کے اجتہادات حتیٰ کہ اجماعِ صحابہؓ کی بھی پابند نہیں ہے۔
- اجتہادِ مطلق کا دروازہ کسی دور میں بھی بند نہیں ہوا، آج بھی یہ دروازہ کھلا ہے، اور علامہ اقبالؒ بھی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کی طرح مجتہدِ مطلق کے منصب پر فائز ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے یہ باتیں کہی ہیں یا نہیں، اور اگر کہی ہیں تو کس پس منظر میں کہی ہیں، ان تمام باتوں سے قطع نظر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس نئے فکر کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اگر غور کیا جائے تو اس حقیقت کے ادراک میں کوئی دقّت پیش نہیں آتی کہ یہ بات حتمی دیکھ کر کہ مسلمانوں کو کسی حالت میں بھی قرآن و سنت سے ہٹانا ممکن نہیں ہے، اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کا اختیار ایسے اداروں کو دے دیا جائے جو مفاد پرست طبقوں اور افراد کی خواہشات کے مطابق قرآن و سنت کی تعبیر نو کر سکیں، اس طور پر کہ قرآن و سنت پر عمل کا نعرہ متاثر نہ ہو، اور قرآن و سنت کے حقیقی نفاذ سے بعض طبقات، اداروں اور افراد کے مفادات پر جو زد پڑتی ہے اس سے بھی محفوظ رہا جا سکے۔

اور پھر ستم کی بات یہ ہے کہ اجتہاد اور تعبیرِ شریعت کا اختیار ایک ایسے ادارے کے لیے طلب کیا

جا رہا ہے جس کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی مطلوبہ علمی اور تجرباتی اہلیت تو کجا قرآن کریم ناظرہ پڑھ سکنا بھی شرط نہیں ہے۔ ہم نے اس کے جواب میں عرض کیا ہے کہ ہم پارلیمنٹ کو تعبیرِ شریعت کا اختیار دینے کے لیے تیار نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اتنی علمی اہلیت و استعداد کو شرط قرار دیا جائے جو اجتہاد اور تعبیرِ شریعت کے لیے ناگزیر ہے۔

اس فکر کے داعیوں نے اپنے جدید فکر کے حق میں بظاہر بڑی دلکش دلیل دی ہے کہ علماء اس وقت چار پانچ فقہی مذاہب میں بٹے ہوئے ہیں، اس لیے نفاذِ اسلام کے عمل کو فرقہ واریت کے اثرات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ تعبیرِ شریعت کا حق علماء سے واپس لے کر پارلیمنٹ کو دے دیا جائے۔ لیکن ان لوگوں کی توجہ اس کے منطقی نتیجہ کی طرف نہیں گئی کہ چار پانچ فقہوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے عالمِ اسلام میں موجود تمام منتخب اسمبلیوں کو اجتہاد کا حق دینے سے ان اسمبلیوں کے الگ الگ اجتہادات کی بنیاد پر جو سینکڑوں علاقائی اور جغرافیائی فقہیں تشکیل پائیں گی، اس کی فرقہ واریت کی دلدل سے امت کو نکالنے کے لیے یہ حضرات پھر کیا راستہ تجویز کریں گے؟ صرف پاکستان میں وفاقی، پنجابی، سندھی، سرحدی اور بلوچی اسمبلیوں کی الگ الگ پانچ فقہیں بنیں گی، اور چار یا پانچ فقہوں سے نجات دلانے کے شوق میں امت کو سینکڑوں نئی فقہوں کی دلدل میں دھکیل دیا جائے گا۔ الغرض یہ ایک باطل فکر ہے جس کی طرف علماء اور دینی دانشوروں کو فوری توجہ دینی چاہیے۔

اقبالؒ کے نادان دوستوں سے!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۷ نومبر ۱۹۸۷ء)

علامہ محمد اقبال مرحوم کو پاکستان کے عوام ایک مخلص قومی مفکر اور راہنما کی حیثیت سے پہچانتے ہیں جس نے برصغیر پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں بسنے والے مسلمانوں کے ملی جذبات کو ابھارنے اور ان میں عظمتِ رفتہ کی بحالی کا احساس اجاگر کرنے کے لیے مسلسل محنت کی، اور اس خطۂ زمین کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا تصور پیش کر کے تحریکِ پاکستان کی فکری بنیاد رکھی۔ علامہ اقبالؒ کی فکری، علمی وعملی زندگی کے مختلف اور متنوع مراحل اگرچہ اہلِ فکر ونظر سے مخفی نہیں ہیں لیکن عام مسلمان کو اس اتار چڑھاؤ سے کوئی واقفیت ہے اور نہ ہی دلچسپی بلکہ وہ ان پیچیدگیوں سے کلیتاً بے خبر ایک دردمند اور پُرخلوص قومی مفکر کی حیثیت سے علامہ اقبالؒ کو دل میں بسائے ہوئے ہیں۔

مگر کچھ عرصہ سے اقبالؒ کے کچھ نادان دوستوں نے علامہ اقبالؒ کی بعض ذہنی الجھنوں اور تفردات کو "فکرِ اقبال" کے نام سے اجاگر کرنے اور اس تصوراتی کدال کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کے چودہ سوسالہ اجماعی عقائد ومسلّمات کی مضبوط اور مستحکم عمارت پر ناکام ضربیں لگانے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے اس سے ایک عام مسلمان کی اقبالؒ کے ساتھ عقیدت مجروح ہو رہی ہے۔

اس سے قبل محکمہ اوقاف کے ایک افسر ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ نے اقبالؒ کو ایک ایسے آزاد مجتہد کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی تھی جو جدید دور میں قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کا اختیار نہ صرف یہ کہ علم واہلیت کے کسی معیار کے بغیر پارلیمنٹ کے ارکان کو دینے کا داعی ہے، بلکہ انہیں چودہ سوسالہ اجماعی تعبیرات وتشریحات حتیٰ کہ اجماعِ صحابہ کرامؓ کی پابندی تک سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اب خود علامہ اقبالؒ کے فرزند اور سپریم کورٹ کے جسٹس جناب جاوید اقبال نے لاہور میں "یومِ اقبال" کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے ملوکیت اور شہنشاہیت کی طرح "خلافت" کے نظریہ کو بھی رد کر دیا تھا۔ (بحوالہ روزنامہ امروز۔ ۲۰ نومبر ۱۹۸۷ء)

ہمارے خیال میں علامہ اقبالؒ کو اس روپ میں پیش کرنا نہ ان کے ساتھ انصاف ہے اور نہ ہی

ملک و قوم کی کوئی خدمت ہے، کیونکہ اقبالؒ کا یہ روپ عام مسلمانوں کے لیے بالکل نیا ہو گا جو عقیدت و محبت کے پرانے سانچوں میں شاید فٹ نہ بیٹھ سکے۔ کیا اقبالؒ کے ''نادان دوست'' اپنی نئی مہم کے اس پہلو پر غور کی زحمت گوارا کریں گے ؟

علامہ اقبالؒ کے نام پر گمراہ کُن خیالات

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۸ جنوری ۱۹۸۸ء)

مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے بارے میں سردار محمد عبد القیوم خان کی ناروے کی تقریر کے حوالہ سے جو باتیں منظر عام پر آئی ہیں وہ غیر محتاط ضرور ہیں لیکن یہ سب کچھ علامہ اقبالؒ کے بعض نادان دوستوں کی اس نئی مہم کا فطری ردعمل ہے جو انہوں نے اقبالؒ کو پیغمبر اور فکرِ اقبالؒ کو وحی کے طور پر پیش کرنے کی صورت میں شروع کر رکھی ہے۔ ہم سردار عبد القیوم خانؒ کے اندازِ بیان سے متفق نہیں ہیں لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر یوسف گرایہ کے ساتھ ساتھ روزنامہ جنگ اور روزنامہ نوائے وقت نے علامہ اقبالؒ کو جس روپ میں پیش کرنے کی مہم کچھ عرصہ سے چلا رکھی ہے وہ بلاشبہ ایک گمراہ کرنے والے مفکر کا روپ ہے جس پر صرف اقبالؒ کے ساتھ عقیدت کے پردہ میں خاموشی اختیار نہیں کی جا سکتی۔

جب علامہ اقبالؒ کی زبان سے یہ کہلوایا جائے گا کہ اسلام کے تصورِ آخرت و قیامت کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے، اور قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح میں صحابہ کرامؓ کے متفقہ فیصلوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے، تو پھر کسی کو اس خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ محض اقبالؒ کے ساتھ عقیدت کے پردے میں ان گمراہ کن خیالات کو برداشت کر لیا جائے گا۔ علامہ محمد اقبالؒ کو ملتِ اسلامیہ میں بیداری کی روح پھونکنے والے انقلابی شاعر اور مفکرِ پاکستان کی حیثیت سے تمام طبقوں میں احترام و عقیدت کا مقام حاصل ہے۔ اور اس احترام و عقیدت کا تقاضا یہ ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال اور ان کے رفقاء نئی نظریاتی بحثوں میں علامہ اقبالؒ کو فریق نہ بنائیں بلکہ اپنے افکار و خیالات کو خود اپنے حوالہ سے پیش کر کے منطق و استدلال کے ساتھ مخالفین کا سامنا کریں۔

ملتِ اسلامیہ کے اجماعی عقائد سے انحراف پر مشتمل خیالات کو علامہ محمد اقبالؒ کے نام پر پیش کر کے اقبالؒ کی عقیدت کے زور پر اسے منوانے کی کوشش نہ صرف اس عقیدت کا استحصال ہے بلکہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کو اقبالؒ سے دور کرنے کی سازش ہے۔ اس لیے ہم بڑے ادب سے گزارش

کریں گے کہ علامہ اقبالؒ کی شخصیت کو متنازعہ بنانے سے گریز کیا جائے۔

اس نئی مہم میں روزنامہ جنگ اور روزنامہ نوائے وقت بھی پوری طرح شریک ہیں لیکن ان میں یہ اخلاقی جرأت نہیں ہے کہ وہ مخالفین کے نقطۂ نظر کو اپنے صفحات میں مناسب جگہ دے کر انصاف کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ ہم اپنے اس موقف پر کسی بھی پلیٹ فارم پر بحث و گفتگو کے لیے تیار ہیں کہ ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر یوسف گورایہ علامہ اقبالؒ کو ایک گمراہ مفکر کے روپ میں پیش کر کے ان کے ساتھ عوام کی عقیدت کو مجروح کر رہے ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ اور سردار محمد عبد القیوم خان

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ـ ۲۲ جنوری ۱۹۸۸ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ڈاکٹر جاوید اقبال اور سردار محمد عبد القیوم خان کی ناروے کی تقاریر کے حوالے سے جس افسوسناک بحث کا آغاز کیا تھا اس کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے، اور نوائے وقت اس بحث کو بلاوجہ طول دے کر اس مطالبہ پر اصرار کر رہا ہے کہ سردار محمد عبد القیوم خان اپنی ناروے کی تقریر میں علامہ محمد اقبالؒ کی مبینہ توہین پر معافی مانگیں۔ جبکہ سردار صاحب کا موقف یہ ہے کہ انہوں نے علامہ محمد اقبالؒ کی توہین نہیں کی بلکہ علامہ اقبالؒ کے نام سے غلط نظریات اور گمراہ کن خیالات پیش کرنے والوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور اس پر وہ کسی معذرت کے لیے تیار نہیں ہیں۔

جہاں تک علامہ محمد اقبالؒ کے نام سے گمراہ کن نظریات پیش کرنے کا تعلق ہے اس کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے، حتیٰ کہ پاکستان میں کمیونزم اور انکارِ حدیث کے فتنوں کا آغاز بھی علامہ اقبالؒ کے بعض اشعار و اقوال کو توڑ موڑ کر اس کے حوالہ سے کیا گیا تھا۔ لیکن یہ سازش ناکام ہوئی اور اقبالؒ کے نام کو زیادہ دیر تک استعمال نہ کیا جا سکا۔ اور پھر کچھ لوگ دین کی من مانی تعبیر و تشریح کا دروازہ کھولنے کے لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو درمیان سے ہٹانے کی فکر میں ہیں اور اس کے لیے اقبالؒ کا نام استعمال کر رہے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سردار محمد عبد القیوم خان نے اسی طرزِ عمل کو اپنی گرم گفتار کا ہدف بنایا ہے اور وہ اقبالؒ کے نام پر اسی نئی فتنہ پروری پر احتجاج کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم سردار محمد عبد القیوم خان کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے روزنامہ نوائے وقت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس بحث کو طول نہ دے، کیونکہ جب بات توہین کی ہوگی تو علامہ اقبالؒ کی طرف گمراہ کن نظریات کو منسوب کرنا اور اقبالؒ کے نام پر قوم کو گمراہ کرنا زیادہ بڑی توہین قرار پائے گا، اور پھر خود نوائے وقت اور اس کے ممدوح ڈاکٹر جاوید اقبال کو معافی کے کٹہرے تک آنا پڑے گا، اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس بحث کو یہیں سمیٹ لیا جائے۔

اسلام کی تشریح اور علامہ محمد اقبالؒ: پیپلز پارٹی کا نقطۂ نظر

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔۲۶ فروری ۱۹۸۸ء)

پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو نے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترامیم کے خلاف سپریم کورٹ میں جو آئینی پٹیشن دائر کر رکھی ہے اس پر سپریم کورٹ کے گیارہ رکنی فل بینچ نے گیارہ روز بحث کے بعد فیصلہ محفوظ کر لیا ہے۔ رٹ پٹیشن کے دوران بے نظیر بھٹو کے وکیل اور پیپلز پارٹی کے راہنما جناب یحییٰ بختیار نے دیگر متعلقہ امور کے علاوہ نظریۂ پاکستان کے حوالہ سے اسلام کی تعبیر وتشریح کے بارے میں اپنی پارٹی کا نقطۂ نظر بھی عدالت کے سامنے پیش کیا ہے جو بلاشبہ اس اہم اور نازک مسئلہ پر پیپلز پارٹی کے باضابطہ اور ذمہ دارانہ موقف کی حیثیت رکھتا ہے۔ جناب یحییٰ بختیار نے اس ضمن میں جو کچھ کہا اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

- جہاں تک نظریۂ اسلام اور نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے تو ہم ان دونوں پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی فکر کے مطابق اسلام اور نظریۂ اسلام کی تشریح کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔
- اسلام مکمل دین ہے اس لیے ہر مسلمان کو قرآن کریم کی تشریح کرنے کا حق حاصل ہے۔ کوئی مولوی، شوریٰ، اسلامی نظریاتی کونسل یا شرعی عدالت اس بات کی پابندی نہیں لگا سکتی کہ قرآن وسنت کے بارے میں اسی کی تشریح کو قبول کیا جائے۔
- قرآن وسنت کی تشریح کا اسلامی طریقہ اجماع ہے جو عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔
- شریعت کی تشریح صرف منتخب نمائندوں کا حق ہے۔
- ہم اسلام کے خلاف نہیں تھیوکریسی اور ملائیت کے خلاف ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے واضح طور پر کہا تھا کہ آج کے دور میں اجتہاد صرف منتخب نمائندوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ، لاہور۔۱۸ فروری ۱۹۸۸ء)

یہ نقطۂ نظر نیا نہیں بلکہ اس سے پہلے ”شریعت بل“ کی بحث کے دوران حکمران حلقوں کی طرف

سے بھی کم و بیش یہی موقف پیش کیا جا چکا ہے اور سپریم کورٹ کے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور ان کے رفقاء کی طرف سے اس موقف پر مسلسل اصرار کیا جا رہا ہے۔ لیکن ملک کی سیاسی جماعتوں میں پاکستان پیپلز پارٹی وہ پہلی جماعت ہے جس نے اس نقطۂ نظر کو باضابطہ پارٹی موقف کی حیثیت دے کر ملک کی اعلیٰ ترین عدالت میں پیش کر دیا ہے۔

دورِ حاضر میں قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے حق اور دائرۂ کار کی بحث جو سنجیدہ اور عملی رخ اختیار کرتی جا رہی ہے وہ تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کی گہری اور بھرپور توجہ کی مستحق ہے۔ اگر علماء کرام نے اس کی اہمیت و نزاکت کا بروقت ادراک و احساس نہ کیا تو اس کے فکری و عملی نتائج کی ذمہ داری سے وہ خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکیں گے۔

اقبالؒ کے نام پر فتنہ خیزی!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۶ مئی ۱۹۸۸ء)

ماہِ رواں کی اکیس تاریخ کو علامہ محمد اقبال مرحوم کی پچاسویں برسی منائی گئی اور حسبِ معمول مختلف مقامات پر اجتماعات منعقد ہوئے۔ اس موقع پر لاہور کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے علامہ محمد اقبالؒ کے فرزند اور سپریم کورٹ کے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے حسبِ سابق اپنے اس موقف کو علامہ اقبالؒ کے حوالہ سے دہرایا کہ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق پورے دین کی نئی تعبیر و تشریح ضروری ہے اور یہ کام اجتہاد کے نام پر پارلیمنٹ ہی کر سکتی ہے۔ ہم اس سے قبل اس گمراہ کن موقف پر ان صفحات میں اظہارِ خیال کر چکے ہیں اور ہمارے نزدیک پارلیمنٹ کے ذریعے اجتہاد کے نام پر پورے دین کی نئی تعبیر و تشریح کا یہ مجوزہ کام بنی اسرائیل کے نام نہاد دانشوروں کے اس طرزِ عمل کے مشابہ ہے جو انہوں نے توراۃ اور انجیل کی نئی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے اختیار کیا تھا، اور جسے قرآن کریم نے جابجا تحریف قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی ہے۔

چند روز پہلے ''ایوانِ وقت'' میں کچھ اور جسٹس صاحبان نے بھی اسی موضوع پر ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ پارلیمنٹ کے ذریعے دین کے تمام امور حتیٰ کہ منصوص مسائل میں بھی اجتہاد کی ضرورت ہے۔

اس بحث کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ روزنامہ نوائے وقت کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ یہ فتنہ بڑھتا جا رہا ہے مگر علماء کرام اور ملک کے علمی حلقے اس بحث کی سنگینی کو محسوس نہیں کر رہے۔ ہم تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ صورتحال کی سنگینی کا احساس کریں اور اپنے روایتی کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے علمی بنیاد پر اس فتنہ کا تعاقب کر کے رائے عامہ کو گمراہی سے بچائیں۔

شریعت بل، پارلیمنٹ کی خود مختاری اور اجتہاد

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء)

صدر مملکت کی طرف سے قومی اسمبلی توڑے جانے کے بعد عوامی سطح پر ''شریعت بل'' کے بارے میں بحث وتمحیص کا سلسلہ اگرچہ وقتی طور پر رک گیا ہے، اور شریعت بل کی منظوری اور نفاذ کے بارے میں لوگ ۲۴ اکتوبر کو معرضِ وجود میں آنے والی قومی اسمبلی کا انتظار کر رہے ہیں، لیکن اہلِ دانش کے ہاں شریعت بل پر بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ ملک کے دو معروف قانون دانوں ریٹائرڈ جسٹس جناب جاوید اقبال اور جناب ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کے مضامین گزشتہ دنوں روزنامہ جنگ کے ادارتی صفحات کی زینت بنے ہیں جن میں شریعت بل کے حوالہ سے چند نکات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کے اہم نکات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ تصویر کے دونوں رخ قارئین کے سامنے رہیں اور انہیں کسی نتیجہ تک پہنچنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے مضمون میں جن نکات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ یہ ہیں:

- تحریکِ پاکستان میں عوام نے علماء کی سوچ کو مسترد کر کے علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی سوچ کو اپنایا تھا، اس لیے پاکستان میں اسلام کا نفاذ علماء کی بجائے علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی سوچ اور فکر کے مطابق ہونا چاہیے۔
- عصرِ حاضر کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق اسلامی احکام میں وسیع تر اجتہاد کی ضرورت ہے، اور علماء مختلف وجوہ کی بنا پر اجتہاد کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں رہے، اس لیے دین کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد کے تمام تر اختیارات منتخب پارلیمنٹ کے حوالہ کر دینے چاہئیں۔
- پارلیمنٹ کی بالادستی سے شریعت کی توہین ہوتی ہے اور شریعت کی بالادستی سے پارلیمنٹ کی خود مختاری مجروح ہوتی ہے، اس لیے قانونِ نفاذِ شریعت میں ''قطع وبرید'' کر کے کوئی

درمیانی راہ نکالنی چاہیے۔

جب کہ جناب ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کے اٹھائے ہوئے زیادہ نکات درج ذیل ہیں:

- قراردادِ مقاصد میں کسی جگہ بھی شریعت کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، اس لیے شریعت بل کا قراردادِ مقاصد کے ساتھ تعلق جوڑ کر علماء کرام قراردادِ مقاصد کی غلط تشریح کر رہے ہیں۔
- جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے قراردادِ مقاصد کو آئین کا واجب العمل حصہ بنا کر غلطی کی ہے کیونکہ سیاسی حالات کے مدّ و جزر میں آئین کے ٹوٹنے اور معطل ہونے کا خطرہ رہتا ہے، اس لیے قراردادِ مقاصد کو آئین کا عملی حصہ بنا کر اسے بھی معرضِ خطر میں ڈال دیا گیا ہے۔

جہاں تک تحریکِ پاکستان میں علماء کی سوچ کو عوام کی طرف سے مسترد کیے جانے کا تعلق ہے، ہمیں افسوس ہے کہ تاریخی حقائق اس دعوے میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال کا ساتھ نہیں دے رہے، کیونکہ علماء کے ایک طبقہ نے تحریکِ پاکستان کی ضرور مخالفت کی تھی اور وہ اپنی اس مخالفت پر کسی قسم کا نقاب ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، لیکن علماء ہی کا ایک بہت بڑا طبقہ تحریکِ پاکستان کے ہراول دستہ کے طور پر قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں شریک تھا۔ آخر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب تحریکِ پاکستان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ اور ان کے ہزاروں رفقاء کے وجود کو کس طرح نظر انداز کر جاتے ہیں جو نہ صرف تحریکِ پاکستان کی صفِ اول میں شامل تھے بلکہ صوبہ سرحد اور سلہٹ میں پاکستان کے حق میں ریفرنڈم جیتنے میں انہی علماء کا رول بنیادی اور فیصلہ کن رہا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو حقائق کی بالکل صحیح ترجمانی ہوگی کہ تحریکِ پاکستان کے نظریاتی اور اسلامی تشخص پر عوام کا اعتماد انہی علماء و مشائخ کی بدولت قائم ہوا تھا۔

پھر یہ کہنا کہ علامہ محمد اقبالؒ اور قائد اعظمؒ اسلام کی تعبیر و تشریح کے بارے میں جمہور مسلمانوں سے ہٹ کر کسی نئے فکر کے داعی تھے، ان دونوں شخصیات کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ نے دین کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کی عمومی ضرورت کے حوالہ سے اپنے خیالات و افکار پیش کیے ہیں جو عام علماء کے موقف سے مختلف ہیں، لیکن انہوں نے ان افکار و خیالات کو فقہی مذہب اور نئے فکر کے طور پر کبھی پیش نہیں کیا اور نہ ہی اس پر اصرار کیا ہے کہ ان کے خیالات کو من

وعن قبول کر لیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس ضمن میں علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی حیثیت تجاویز کی ہے جو انہوں نے علمی حلقوں کے سامنے پیش کیں، اور علمی حلقوں کا اجتماعی طرزِ عمل شاہد ہے کہ انہوں نے علامہ محمد اقبالؒ کے تمام تر احترام کے باوجود ان تجاویز کو قبول نہیں کیا، لیکن اس توازن کے ساتھ کہ نہ تو ان شاذ افکار کی بنیاد پر علامہ محمد اقبالؒ کو اپنے روایتی طرزِ تنقید کا ہدف بنایا ہے، اور نہ ہی ان کے افکار کو من وعن قبول کیا ہے۔

جمہور اہلِ علم کے اس حق سے ڈاکٹر جاوید اقبال بھی انکار نہیں کریں گے کہ وہ کسی بھی سوچ اور فکر کو، خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کی طرف سے آئی ہو، دین وعلم کے مسلّمہ اصول وضوابط سے ہٹا ہوا دیکھیں تو اسے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیں۔ کیونکہ جب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب علامہ محمد اقبالؒ کے حوالہ سے اپنے لیے یہ حق مانگتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متفقہ اور اجماعی فیصلوں کو مصلحتِ وقت کے موافق نہ پائیں تو قبول نہ کریں، تو علامہ محمد اقبالؒ کی کسی سوچ اور رائے کی حیثیت صحابہ کرامؓ کے اجماع سے زیادہ تو نہیں ہے کہ اسے ہر صورت قبول کرنے پر اصرار کیا جائے اور کسی کو اس سے اختلاف کا حق نہ دیا جائے۔ پھر جب بات جمہوریت کی ہے تو یہ اصول اہلِ علم کے لیے کیوں نہیں ہے، اور ملک کے جمہور اہلِ علم اور اہلِ دین کے مقابلہ میں ایک شخصی رائے پر اصرار کیوں کیا جا رہا ہے؟

بہر حال ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبالؒ دین میں تعبیر وتشریح کے حوالہ سے کسی نئے فقہی مذہب اور مکتبِ فکر کے بانی اور داعی نہیں تھے، نہ انہوں نے اس کا دعویٰ کیا، نہ اس کے لیے حلقہ بنایا، اور نہ ہی عامۃ الناس کو دعوت دی کہ وہ علماء کی بیان کردہ تشریحِ دین کو مسترد کر کے ان کے اس مبینہ مکتبِ فکر کو قبول کریں۔ بات صرف اتنی تھی کہ علامہ محمد اقبالؒ نے ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ اپنے افکار وخیالات کو تجاویز کی صورت میں اہلِ علم کے سامنے پیش کیا لیکن جمہور اہلِ علم نے مرحوم کے خلوص، جذبہ خیر خواہی اور احترام کے باعث انہیں خاموشی کے ساتھ نظر انداز کر دیا، جس سے بات ختم ہو گئی۔ لیکن اب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب تاریخ کے حوالے ہو جانے والے اس مسئلہ کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنے قابلِ صد احترام مرحوم والد کے کندھے پر رکھ کر ایک نئے مکتبِ فکر کے قیام کی بندوق داغنے کے درپے ہیں، یہ تو خود علامہ محمد اقبالؒ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

باقی رہی بات تحریکِ پاکستان کی تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تحریکِ پاکستان کا اسلامی اور نظریاتی تشخص مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالحامد بدایونیؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ اور ان کے اہلِ علم رفقاء سے وابستہ ہے، اس لیے پاکستان میں اسلام کی تعبیر وتشریح انہی اصول وضوابط کے مطابق ہوگی جن کے یہ مذکورہ بالا اہلِ علم داعی ہیں، اور وہ اصول وضوابط ان حضرات کے طے کردہ نہیں ہیں بلکہ چودہ سو سال سے امت کا اجماعی تعامُل انہی اصولوں پر ہے، اور آج بھی پاکستان بلکہ پورے عالمِ اسلام کے جمہور اہلِ علم ان اصول وضوابط کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب آئیے اجتہاد کی عمومی ضرورت اور پارلیمنٹ کو اس کا حق دینے کے سوال کی طرف۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ آج کے دور میں بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر وسیع تر اجتہاد کی ضرورت ہے، علماء بھی اس ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، بلکہ اپنے اپنے دائرۂ کار میں اجتہاد کر بھی رہے ہیں۔ ملک کے ہر بڑے جامعہ اور دارالعلوم میں دارالافتاء موجود ہے اور مفتیانِ کرام روزمرہ پیش آمدہ مسائل وامور پر فتوے جاری کر رہے ہیں۔ ان فتاویٰ میں جمود نہیں ہے بلکہ اجتہاد وتحرّک پوری طرح کارفرما ہے۔ مفتیانِ کرام عمومی ضروریات اور مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے پیشرو فقہائے کرام کے فیصلوں سے اختلاف بھی کر رہے ہیں، اور بوقتِ ضرورت دوسرے فقہی مذاہب کے فیصلوں کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نئی آرا بھی قائم کر رہے ہیں۔

دینی اداروں کے شعبہ ہائے فتاویٰ سے ہٹ کر قومی سطح پر اسلامی نظریاتی کونسل کے پلیٹ فارم پر نفاذِ اسلام کے لیے جو علمی کام گزشتہ دس سال کے دوران ہوا ہے، اس میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام نے مل بیٹھ کر پیش آمدہ مسائل کا حل نکالا ہے، مسوداتِ قانون ترتیب دیے ہیں اور متعدد نئے فقہی نکات اٹھائے ہیں۔

اجتہاد اسی کا نام ہے اور اجتہاد کا یہ عمل انفرادی اور اجتماعی سطح پر جاری وساری ہے، جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت میں علماء کرام نے اجتہاد اور تعبیرِ دین کے اس عمل میں جدید قانون دان حضرات کے ساتھ اشتراک کو فراخ دلی کے ساتھ قبول کیا ہے اور مل جل کر اجتہاد کے اس عمل کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ''شریعت بل'' کے ذریعے

قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کے تمام تر اختیارات وفاقی شرعی عدالت کے حوالے کر دیے ہیں جس میں عصری قانونی ماہرین کو علماء پر عددی برتری حاصل ہے۔

یہ متواتر پیشرفت اس امر کی شاہد ہے کہ علماء نہ تو فقہی جمود کے قائل ہیں، نہ اجتہاد کی راہ میں رکاوٹ ہیں، اور نہ ہی اجتہاد اور تعبیرِ دین پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے درپے ہیں۔ البتہ وہ یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ اجتہاد کے عمل کو صحیح طور پر آگے بڑھانے کے لیے دو امور کی پابندی بہرحال ضروری ہے: ایک اجتہاد کا دائرۂ کار اور دوسرا اجتہاد کی اہلیت۔ کیونکہ ان دو باتوں کا لحاظ رکھے بغیر اجتہاد کے نام پر کیا جانے والا کوئی بھی عمل اجتہاد نہیں ہوگا، بلکہ الحاد اور زندقہ کی حدود میں داخل ہو جائے گا۔

اجتہاد کا دائرۂ کار خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ والی حدیث میں متعیّن فرما دیا ہے کہ جس مسئلہ میں قرآن کریم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واضح حکم نہ ہو اس میں مجتہد کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کے صریح احکام دائرۂ اجتہاد سے خارج ہیں اور ان میں اجتہاد کے نام پر کسی قسم کے ردوبدل کی گنجائش نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص یا ادارہ قرآن وسنت کے کسی صریح حکم کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اور اسے ”اجتہاد“ کا نام دیتا ہے تو علماء اسے تسلیم نہیں کرتے اور اسے الحاد قرار دیتے ہیں، لیکن ہمارے مہربانوں کو شکوہ ہے کہ علماء جمود کے قائل ہیں اور اجتہاد سے انکار کر رہے ہیں۔

اجتہاد کے ضمن میں دوسرا بنیادی پہلو اہلیت کا ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کے لیے قرآن وسنت سے واقفیت ضروری ہے۔ ایک شخص جو قرآن کریم کی کوئی آیت یا حدیثِ رسول کا کوئی جملہ پڑھ کر براہ راست اس کا مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر ہے، اسے قرآن وسنت کا شارح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے جس پر کسی دلیل اور بحث کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ امام ولی اللہ دہلویؒ نے تو اجتہاد کے لیے قرآن وسنت سے واقفیت کا بہت بلند معیار بیان کیا ہے اور ”ازالۃ الخفاء“ میں اجتہاد کی اہلیت کے لیے ایک درجن سے زائد علوم کی مہارت کو شرط قرار دیا ہے۔ ان کی یہ بات بالکل منطقی اور معقول ہے جس کی تفصیل میں جائے بغیر صرف ایک مثال سے ہم اپنے موقف کو واضح کریں گے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ دیگر ضروری علوم کی مکمل مہارت کے ساتھ ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور حالاتِ زندگی پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ کیونکہ بسا اوقات اس کے سامنے کسی مسئلہ میں جناب نبی اکرمؐ کے دو یا تین متفاوت ارشادات یا عمل آئیں گے، اس نے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان میں سے آخری عمل کو ناسخ قرار دے کر قبول کرے گا اور باقی کو منسوخ سمجھے گا۔ اب وہ آخری عمل کا فیصلہ کیسے کرے گا؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے جناب رسالت مآبؐ کے ارشادات اور احوال سے اس قدر واقفیت حاصل ہو کہ وہ آپ کے اعمال میں واقعاتی ترتیب قائم کر سکے اور یہ فیصلہ کر سکے کہ پہلا عمل کون سا ہے اور آخری عمل کون سا ہے، اس کے بغیر یہ فیصلہ کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے جو بات سمجھانے کے لیے عرض کی گئی، ورنہ جن چودہ علوم کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اجتہاد کی اہلیت کے لیے شرط قرار دیا ہے، ان میں سے ہر علم مجتہد کے لیے منطقی اور بدیہی طور پر اسی طرح ضروری ہے۔ اس پس منظر میں جب پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کی بات کی جاتی ہے تو علماء کو اس میں تامّل ہوتا ہے اور وہ تامّل بلاوجہ نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے ضروری علوم کی مہارت تو کجا، قرآن کریم کو سادہ ترجمہ کے ساتھ سمجھنا بھی شرط نہیں ہے۔ آخر ایک ایسے ادارہ کے لیے، جس کے ارکان کی غالب اکثریت قرآن و سنت سے ناواقف ہے اور جس کی رکنیت کے لیے قرآن کریم کا سادہ ترجمہ جاننا بھی شرط نہیں، قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کا حق علماء آخر کیسے تسلیم کر لیں؟

پھر اہلیت کا یہ صرف ایک پہلو ہے کہ اجتہاد کا حق صرف اُسے ہے جسے ضروری علوم پر مہارت حاصل ہو۔ اس کا دوسرا پہلو خدا خوفی اور تقویٰ کا بھی ہے جو علمی اہلیت کے ساتھ اسی سطح پر ضروری ہے۔ ہمارے فقہاء کے ہاں تو خدا خوفی اور تقویٰ کا یہ معیار رہا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اپنے قرض خواہ کے مکان کی دیوار کے سائے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے کہ اس طرح قرض کے ساتھ سایۂ دیوار میں کھڑا ہونے کا نفع شامل ہو جائے گا جو سود بن سکتا ہے۔ ان مجتہدین کے اجتہاد کا حق ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اس پارلیمنٹ کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں جس کی ''ہارس ٹریڈنگ'' کے قصے دنیا بھر میں ہماری قومی رسوائی کا باعث بن رہے ہیں۔ لیکن علماء کو اس سے بھی انکار نہیں ہے، اگر

وہ وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کے لیے اجتہاد کا حق تسلیم کر سکتے ہیں تو پارلیمنٹ کے سامنے سپر انداز ہونے میں بھی انہیں کوئی حجاب نہیں ہے۔ البتہ اجتہاد کے دائرۂ کار اور اہلیت کے اصولوں سے دستبردار ہونے کے لیے وہ کسی صورت میں تیار نہیں ہیں اور اس کے لیے دو امور کو آئینی طور پر قطعیت کے ساتھ طے کرنا ہوگا۔ ایک یہ کہ پارلیمنٹ قرآن وسنت کے صریح احکام میں ردوبدل کی مجاز نہیں ہوگی، اور دوسرا یہ کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن وسنت کی ضروری واقفیت شرط ہوگی۔

محترم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ان دو امور کو تسلیم کر لیں تو پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کے بارے میں ان کے موقف کو قبول کرنے کے لیے ہم تیار ہیں، بلکہ اجتہاد کی اہلیت کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی بیان کردہ سخت شرائط پر بھی ہمیں زیادہ اصرار نہیں ہوگا۔ اور اس ضمن میں بھی ہم اسلامی نظریاتی کونسل یا وفاقی شرعی عدالت کا یہ استحقاق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد کا حق دینے کا مقصد سامنے رکھ کر پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن و سنت سے واقفیت کا معیار طے کر دیں۔ لیکن ان بنیادی امور کو ملحوظ رکھے بغیر اگر پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کی تعبیر وتشریح کا حق دیا جاتا ہے، اور پارلیمنٹ اسے استعمال کرتی ہے، تو ہمارے نزدیک پاپائے روم کی بائبل میں ردوبدل کا حق رکھنے والی کونسلوں کے فیصلوں، اکبر بادشاہ کے درباری اجتہاد کے ذریعے وجود میں آنے والے دینِ الٰہی، اور اجتہاد کے غیر مشروط حق سے بہرہ ور منتخب پارلیمنٹ کے فیصلوں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

اب ہم تیسرے نکتے کی طرف آتے ہیں جس میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے پارلیمنٹ اور شریعت میں سے کسی ایک کی بالادستی کی صورت میں دوسرے کی حیثیت مجروح ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ اور اس طرح علماء کے اس موقف کو پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پارلیمنٹ کی مکمل بالادستی کی صورت میں شریعت کی بالادستی نہیں رہتی، اور یہ نہ صرف شریعت کی توہین ہے بلکہ ایک عام مسلمان کے بنیادی عقیدہ کے بھی منافی ہے۔ لیکن اس کا حل ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے قانونِ نفاذِ شریعت پر پارلیمنٹ کی بالادستی بہرحال قائم رکھنے کی صورت میں تجویز کیا ہے اور اس میں کسی قسم کی لچک کے روادار نہیں ہیں۔ ہمیں ان کے اس موقف سے اختلاف ہے کیونکہ ایک مسلمان کی حیثیت

سے ہمارا بنیادی عقیدہ ہے کہ قرآن وسنت کو دنیا کے ہر ادارے پر بالادستی حاصل ہے، اور کوئی منتخب یا غیر منتخب ادارہ ایسا نہیں ہے جسے قرآن وسنت کے احکام پر بالادستی دی جا سکے۔

اب ہم ملک امجد حسین صاحب ایڈووکیٹ کے اٹھائے ہوئے دو نکات کی طرف آتے ہیں:

ان کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ قراردادِ مقاصد میں ''شریعت'' کا لفظ تک نہیں ہے تو شریعت بل کے لیے اس کا حوالہ کیوں دیا جا رہا ہے؟ مگر یہ بات انتہائی سطحی ہے جس کی اتنے بڑے قانون دان سے کم از کم ہمیں توقع نہیں تھی۔ ''شریعت'' کی اصطلاح خود قرآن کریم کی ارشاد فرمودہ ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ثم جعلناک علٰی شریعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون۔ (الجاثیہ ۱۸)
>
> ''پھر ہم نے آپ کو دین کے بارے میں شریعت پر قائم کیا ہے، پس آپ اس کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔''

اور قراردادِ مقاصد کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''مملکت جملہ حقوق واختیاراتِ حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے، جس میں اصولِ جمہوریت و حریت و مساوات و رواداری اور عدلِ عمرانی کو، جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔''
>
> ''مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ انفرادی واجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات ومقتضیات کے مطابق، جو قرآن مجید اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں متعیّن ہیں، ترتیب دے سکیں۔''

اب آپ خیال فرمائیے کہ قراردادِ مقاصد نے دستوری طور پر اسلام کی تشریحات اور قرآن وسنت کی تعلیمات کی پابندی کو ضروری قرار دیا ہے، اور قرآن کریم نے شریعت کی پیروی کا حکم دیا ہے، تو شریعت کے قرآنی حکم کو اختیار کرنا قراردادِ مقاصد ہی کی تکمیل نہیں تو اور کیا ہے؟

قراردادِ مقاصد ایک اصولی دستاویز ہے، ملک میں اسلامائزیشن کے لیے جتنے اقدامات بھی ہوں گے، اس قراردادِ مقاصد پر عملدرآمد میں پیشرفت شمار ہوں گے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ قراردادِ مقاصد میں ان سب کا تفصیلاً ذکر بھی ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سپریم کورٹ نے قصاص ودیت

آرڈیننس جاری کرنے کا حکومت کو پابند کیا ہے اور حکومت چند روز تک آرڈیننس لا رہی ہے۔ اب کوئی شخص یہ کہے کہ قراردادِ مقاصد میں تو "حدود و قصاص" کا لفظ نہیں ہے اس لیے اس آرڈیننس کے سلسلے میں قراردادِ مقاصد کا حوالہ نہ دیا جائے، تو یہ بالکل غلط بات ہوگی۔ کیونکہ حدود و قصاص کے قانون کا نفاذ بلاشبہ قراردادِ مقاصد کی اس شق پر عملدرآمد ہوگا جس میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی پابندی کی ضمانت دی گئی ہے۔

رہا دوسرا نکتہ کہ قراردادِ مقاصد کو آئین کا عملی حصہ بنا کر معرضِ خطر میں ڈال دیا گیا ہے، تو یہ خدشہ سابقہ تجربات کی بنیاد پر بے بنیاد ہے، کیونکہ پاکستان میں آئین ٹوٹنے اور نئے دستور ترتیب پانے کا افسوسناک عمل اگرچہ متعدّد بار دہرایا گیا ہے، لیکن قراردادِ مقاصد کو کوئی دستور بھی نظر انداز نہیں کر سکا اور ہر آئین میں اسے شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ۱۹۴۹ء میں پہلی دستور ساز اسمبلی میں منظور ہونے والی قراردادِ مقاصد کو ملک کی ایک بنیادی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے جسے کسی بھی دور میں نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

قراردادِ مقاصد میں پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کو ہمیشہ کے لیے طے کر دینے کے علاوہ خدا کی حاکمیت، قرآن و سنت کی بالادستی، اور اسلامی احکام کی عملداری کی ضمانت دی گئی ہے، اور اسلامائزیشن کی ایک مستحکم اور مضبوط آئینی بنیاد فراہم کر دی گئی ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی طرف سے قراردادِ مقاصد کو دستور کا باضابطہ حصہ قرار دیے جانے سے قبل قراردادِ مقاصد کو ۱۹۷۳ء سمیت تمام دساتیر میں محض دیباچہ کی حیثیت سے بطور تبرک شامل کیا جاتا رہا ہے، جس پر عملدرآمد آئینی لحاظ سے ضروری نہیں تھا، مگر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کے تحت حاصل شدہ اختیارات کی رو سے قراردادِ مقاصد کو آئین کا باضابطہ اور قابلِ عمل حصہ بنا دیا، جو قراردادِ مقاصد کا اصل دستوری مقام ہے اور بلاشبہ یہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

شریعت کی تعبیر وتشریح اور علامہ محمد اقبالؒ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جون وجولائی ۱۹۹۲ء)

ان دنوں قومی اخبارات میں ’’عورت کی حکمرانی‘‘ کے بارے میں بحث کا سلسلہ چل رہا ہے اور عورت کی حکمرانی کے جواز اور عدمِ جواز پر دونوں طرف سے اپنے اپنے ذوق کے مطابق دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔ جو حضرات عورت کی حکمرانی کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے وہ اپنے موقف کے حق میں قرآن کریم کی آیت کریمہ "الرجال قوامون علی النساء" (النساء ۳۴) کے علاوہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدّد ارشادات اور امت کا چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل پیش کر رہے ہیں۔ جبکہ جواز کے قائل حضرات قرآن و سنت کے ارشادات کی تاویلات کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے چند جزوی واقعات اور بعض اہلِ علم کے انفرادی اقوال کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس بحث کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور کیا امتِ مسلمہ کے اہلِ علم اس بحث کی روشنی میں اپنے چودہ سو سالہ اجتماعی موقف اور تعامُل سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی سرِدست ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن اس ضمن میں مؤقر قومی روزنامہ جنگ کے محترم کالم نگار جناب عبد اللطیف سیٹھی نے جنگ لاہور ۱۲ جون ۱۹۹۲ء میں مطبوعہ کالم کے ذریعے اس بحث کو ختم کرنے کی جو تجویز پیش فرمائی ہے، اس کا جائزہ لینا بہرحال ضروری ہے۔

جناب سیٹھی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ عورت ایک اسلامی ملک کی سربراہ ہو سکتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے کسی جگہ تحریر کر دیا ہے کہ عورت خلیفہ ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ سیٹھی صاحب کا یہ ارشاد بھی ہے کہ چونکہ علماء کی اکثریت نے پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں حصہ نہیں لیا تھا اور پاکستان ان کی مرضی کے خلاف علامہ اقبالؒ کی سوچ کے مطابق بنا ہے، اس لیے پاکستان میں دین کی وہی تشریح قابلِ قبول ہوگی جو علامہ اقبالؒ نے کی ہے۔ چنانچہ اس پس منظر میں عبداللطیف سیٹھی صاحب نے فرمایا ہے کہ:

’’حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی ایک انگلش تحریر میں فرمایا تھا کہ عورت بطور خلیفہ

الیکشن میں منتخب ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ صاف الفاظ میں یہ بات اب نہیں ہو سکتی اور اس مسئلہ پر اب بحث ختم ہونی چاہیے۔ آخر کسی ایک کو اتھارٹی تو ماننا ہی پڑے گا اور اقبالؒ سے بڑی اسلامی امور پر اندریں زمانہ کوئی اتھارٹی نہیں ہو سکتی۔"

جہاں تک قیامِ پاکستان کی جدوجہد کا تعلق ہے، جناب عبد اللطیف سیٹھی اور ان کے ہمنوا ایک عرصہ سے رائے عامہ کو یہ مغالطہ دینے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں کہ علماء کی اکثریت نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ جبکہ یہ بات تاریخی حقائق اور واقعات کے یکسر منافی ہے اور اس کو بار بار دہرائے چلے جانے کا مقصد تاریخ کے ریکارڈ کو خراب کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ علماء کی ایک بڑی جماعت جمعیت علمائے ہند اور اس کے ساتھ مجلسِ احرارِ اسلام نے بھی تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور انہیں اس مخالفت پر آج بھی کوئی ندامت نہیں ہے، کیونکہ جن خدشات وشبہات کی بنیاد پر وہ قیامِ پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، قیامِ پاکستان کے بعد کی پینتالیس سالہ تاریخ نے ان میں سے کسی ایک کی بھی نفی نہیں کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام کی بڑی بڑی جماعتیں اور اکابر علماء قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں عملاً شریک رہے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا اطہر علیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ میں سے کس بزرگ کی خدمات کی تحریکِ پاکستان سے نفی کی جا سکتی ہے؟ ان میں سے بعض بزرگ تو وہ ہیں کہ جن کی شبانہ روز محنت کے بغیر مسلم لیگ صوبہ سرحد اور سلہٹ کا ریفرنڈم جیتنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ان اکابر علماء کے ساتھ علماء اور کارکنوں کی ایک کھیپ تھی جس نے ہر جگہ قیامِ پاکستان کے لیے اَن تھک محنت کی، اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تحریکِ پاکستان کا اسلامی اور نظریاتی تشخص ان علماء اور کارکنوں کی وجہ سے ہی عام مسلمانوں کے ذہنوں میں قائم ہوا، ورنہ تحریکِ پاکستان کی اصل قیادت کے ذہنی رجحانات اور نظریاتی اعتبار کے بارے میں تو مسلم لیگی راہنماؤں جناب میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، جناب سردار شوکت حیات، اور جناب راجہ صاحب محمود آباد کے ان اعترافات کے بعد کسی تبصرہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ قیامِ پاکستان کا مقصد صرف ہندوؤں کے معاشی تسلط سے نجات حاصل کرنا تھا، جبکہ اسلامی نظام اور لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ صرف عام مسلمانوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔

اس لیے محترم جناب عبد اللطیف سیٹھی اور ان کے ہمنواؤں سے بصد احترام گزارش ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر ارد گرد کے تاریخی حقائق کا ادراک کریں، اور علماء کی اکثریت پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کا بے بنیاد الزام دہراتے چلے جانے کی بجائے معروضی حقائق کو تسلیم کرنے کی روش اختیار کریں۔ آخر جب بانیٔ پاکستان نے مبینہ طور پر قیامِ پاکستان کے موقع پر پاکستان کا قومی پرچم کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے ہاتھوں لہرا کر تحریکِ پاکستان میں علماء کے کردار کا عملاً اعتراف کر لیا تھا، تو قائداعظم مرحومؒ کے نام کی مالا جپنے والے ان قلمکاروں کو اس قدر واضح حقیقت کے تسلیم کرنے میں کون سا حجاب مانع ہے؟

رہی یہ بات کہ چونکہ علامہ اقبالؒ نے فرما دیا ہے کہ عورت خلیفہ ہو سکتی ہے اس لیے اس بات کو آخری سمجھا جائے اور عورت کی حکمرانی کی بحث کو ختم کر دیا جائے، تو میں یہ بات دوٹوک اور واضح الفاظ میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس بات سے نہ صرف یہ کہ کلیتًا انکار ہے بلکہ ہم اسے دوبارہ سننے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ اس لیے کہ دین میں آخری بات صرف اور صرف جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور اس ذاتِ گرامی کے بعد پوری امت میں کوئی شخصیت بھی ایسی نہیں ہے جس کی بات کو صرف اس لیے آخری اور حتمی قرار دیا جائے کہ چونکہ انہوں نے یہ بات کہہ دی ہے اس لیے بات ختم اب کسی اور بحث کی گنجائش نہیں رہی۔

جناب عبد اللطیف سیٹھی کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت حنفی فقہ کی پیروکار ہے۔ خود علامہ اقبالؒ فقہی امور میں حنفی فقہ کے پیروکار تھے اور انہوں نے وصیت نامہ میں اپنے فرزند کو حنفی فقہ کی پیروی کی تلقین بھی فرمائی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہونے اور کہلانے کے باوجود امام اعظمؒ کی ہر بات کو صرف اس لیے تسلیم نہیں کر لیتے کہ چونکہ یہ بات امام صاحبؒ نے فرما دی ہے اس لیے حرفِ آخر ہے۔ اہلِ علم احنافؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اقوال پر بحث کرتے ہیں، شرعی دلائل کی روشنی میں ان کا جائزہ لیتے ہیں، اور بہت سے مسائل ہیں جن میں احناف دلائل کی بنیاد پر امام صاحبؒ کے قول کی بجائے ان کے تلامذہ میں سے کسی کے قول کو قبول کرتے ہیں۔ اس لیے جب ”حرفِ آخر“ کی حیثیت امام صاحبؒ کو حاصل نہیں ہے جو خود علامہ اقبالؒ کے بھی امام ہیں، تو علامہ اقبالؒ کی اس حیثیت کو آخر کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟ حرفِ آخر کی حیثیت

صرف پیغمبر کی ہوتی ہے جس کے علم کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی ہوتی ہے، اس لیے جناب نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کے بعد نہ کسی شخصیت کے لیے نبوت اور وحی کا امکان تسلیم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کی بات کو حرفِ آخر کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی قومی خدمات، امت کے مسائل پر ان کی گہری نظر، اور ملت کی بہتری کے لیے ان کے جذبات و احساسات سے انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن ان کی شخصیت اور خدمات کے تمام تر اعترافات کے باوجود شرعی معاملات میں ان کے اقوال وارشادات کو اسی طرح شرعی دلائل کی روشنی میں پرکھا جائے گا جس طرح امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، امام حسنؒ، امام زفرؒ اور دوسرے ائمہ کے اقوال وارشادات کو پرکھا جاتا ہے، اور جو بات بھی مسلّمہ شرعی معیار پر پوری نہیں اترے گی، اسے قطعی طور پر رد کر دیا جائے گا۔ اس میں نہ علامہ اقبالؒ کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہے اور نہ ہی پاکستان کے قیام میں ان کے قائدانہ کردار پر کوئی حرف آتا ہے۔ یہ علمی مسائل ہیں جہاں علمی اصول و ضوابط کی فرماں روائی ہے۔ انہیں سیاسی طعن و تشنیع اور الزام کی زبان میں حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ الجھنیں ضرور پیدا ہوں گی جن سے پریشان ہو کر عبداللطیف سیٹھی صاحب عورت کی حکمرانی کی بحث کو ختم کرنے کے لیے بے چین ہیں۔

یہاں اجتہاد کی ماہیت، اس کے دائرۂ کار اور اس کے لیے اہلیت کے معیار کے بارے میں چند امور کی وضاحت از حد ضروری ہے۔ کیونکہ اجتہاد کا جو مطلب و مفہوم آج عام طور پر سمجھا جا رہا ہے، شرعاً اس پر اجتہاد کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ شریعت نے اجتہاد کے کچھ اصول وضوابط متعیّن کیے ہیں جن کا لحاظ قیاس اور اجتہاد کے نام پر کیے جانے والے ہر عمل میں لازماً کیا جائے گا۔

آج کل عام طور پر یہ سمجھا اور کہا جا رہا ہے کہ قرآن و سنت کے جس حکم پر عملدرآمد میں کوئی وقتی یا عارضی معاشرتی مشکل پیش آجائے، علماء کرام باہم مشورہ کے ساتھ اس حکم کو ضرورت کے مطابق تبدیل کر دیں، اس کا نام اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا یہ مفہوم کوئی نیا نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کے ہاں یہی اجتہاد رائج تھا اور علمائے بنی اسرائیل لوگوں کے مطالبات پر زمانہ کے تقاضوں کے پیشِ نظر شرعی احکام میں اسی قسم کی تبدیلیاں کیا کرتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے اس عمل کو اجتہاد کی بجائے تحریف کا نام دیا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ بنی اسرائیل کے جدت پسند لوگوں کے مطالبات اور مصلحت پسند علماء

کی انہی کارروائیوں کے نتیجے میں تورات، زبور اور انجیل اصلی شکل میں موجود نہیں رہیں اور انبیائے بنی اسرائیل کی پیش کردہ شریعتوں کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کے برعکس جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اجتہاد کا تصور دیا ہے، وہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت کے مطابق یوں ہے کہ جس مسئلہ میں قرآن وسنت کا حکم واضح نہ ہو، اس میں اہلِ علم قرآن وسنت کے اصولوں کی روشنی میں کوئی فیصلہ کر لیں۔ یہ اجتہاد حَق ہے اور کسی بھی دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا گیا۔ لیکن جب نئے پیش آمدہ مسئلے کا فیصلہ قرآن وسنت کی روشنی میں کرنا ہے تو منطقی طور پر ضروری ہے کہ فیصلہ کرنے والا شخص یا افراد قرآن وسنت کی روشنی سے بہرہ ور ہوں، اور قرآن وسنت اور ان سے متعلقہ علوم کی اس درجہ کی مہارت رکھتے ہوں کہ وہ ان کی روشنی میں مسائل واحکام کا استنباط کر سکیں۔

گزشتہ دنوں محترم جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دیا جائے اور قوم کے منتخب نمائندے مل بیٹھ کر اجتہادی امور پر فیصلہ دیں۔ ہم نے اس تجویز سے اتفاق کیا تھا اور عرض کیا تھا کہ صرف ایک شرط کے ساتھ ہم اس تجویز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی مطلوبہ اہلیت کو شرط قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ جس پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن کریم کا ناظرہ پڑھنا بھی شرط نہیں ہے، اسے قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد کی ذمہ داری سونپ دینا قرآن وسنت کے ساتھ تو مذاق ہوگا ہی، خود اس پارلیمنٹ کے ارکان پر صریح ظلم ہوگا۔ ہاں اگر الیکشن رولز میں ترمیم کر کے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی اہلیت کو شرط قرار دے دیا جائے تو ہمیں پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے اور اسے بخوشی تسلیم کرنے میں کوئی حجاب نہیں ہوگا۔

جبکہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی اہلیت کا معیار بھی ہم تجویز نہیں کرتے، سپریم کورٹ، وفاقی شرعی عدالت، اور اسلامی نظریاتی کونسل، تینوں باوقار آئینی ادارے ہیں، ان میں سے کسی ایک ادارے سے استصواب کر لیا جائے، وہ اجتہاد کی اہلیت کے لیے جو معیار مقرر کرے اسے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے شرط بنا دیا جائے۔ اس اصولی اور ناگزیر منطقی تقاضے کو نظر انداز کر کے اجتہاد کے نام پر جو عمل کیا جائے گا وہ بنی اسرائیل کے عملِ تحریف سے مختلف نہیں ہوگا۔

اجتہاد کے بارے میں ضروری گزارش کے بعد اب ہم اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں کہ اجتہاد اور

قیاس کے حوالے سے عورت کی حکمرانی کے مسئلہ کی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ عورت کی حکمرانی کے جائز نہ ہونے پر قرآن کریم کی جو آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات پیش کیے جا رہے ہیں، وہ واضح ہیں یا نہیں؟ اگر وہ واضح اور صریح ہیں تو پھر یہ مسئلہ اجتہاد کے دائرے میں نہیں آتا اور اجتہاد کے نام پر اس میں کسی ردوبدل کی حمایت علمی طور پر نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات پرکھنے کا ہمارے پاس پیمانہ بھی موجود ہے کہ امتِ مسلمہ اور اس کے اہلِ علم نے مجموعی طور پر ان آیات و احادیث سے کیا مفہوم مراد لیا ہے؟ اس معیار پر جب ہم ان آیات و احادیث کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت واشگاف صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے کہ امتِ مسلمہ کے تمام معروف مفسرین و محدثین اور تمام مکاتبِ فکر کے نامور مجتہدین و فقہاء ان آیات و احادیث سے عورت کی حکمرانی کے عدمِ جواز پر استدلال کرتے ہیں۔ اور احناف، شوافع، مالکیہ، حنابلہ، ظاہریہ اور اہلِ تشیع کے کسی معروف محدث، مفسر، فقیہ یا مجتہد نے ان آیات و احادیث کے اس اجتماعی مفہوم سے اختلاف نہیں کیا۔ جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یہ آیات و احادیث عورت کی حکمرانی کے عدمِ جواز پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں اور قرآن و سنت کی صراحت کے بعد اس مسئلہ میں اجتہاد کا کوئی دخل باقی نہیں رہ جاتا۔

پھر اگر اس اصول سے کسی حد تک صَرفِ نظر کرتے ہوئے آیات و احادیث کی تشریح و تعبیر اور ان سے احکام و مسائل کے استنباط و استخراج کی حد تک اجتہاد کی گنجائش تسلیم بھی کر لی جائے تو یہ اجتہاد ہو چکا ہے۔ کیونکہ تمام مکاتبِ فکر کے مجتہدین ان آیات و احادیث سے یہ مسئلہ مستنبط کر چکے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ کی رو سے عورت کسی مسلم ریاست میں حکمرانی کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتی۔ اور یہ کسی ایک دور کا اجتہاد نہیں، چودہ سو سال کے تمام ادوار کا اجتماعی اجتہاد ہے۔ اب اس مسئلہ پر اجتہاد کے نام پر کیا جانے والا کوئی بھی عمل اس چودہ سو سالہ اجتماعی تعبیر و تشریح اور متفقہ اجتہاد پر نظرِ ثانی اور اسے ”ری اوپن“ کرنے کا عمل کہلائے گا۔ اجتہاد پر نظرِ ثانی اور اسے ری اوپن کرنے کی بھی کچھ شرائط ہیں اور اس کے کچھ عملی تقاضے ہیں۔ اگر ہمارے دوستوں کے پاس امتِ مسلمہ کے چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل کو ری اوپن کرنے کی کوئی بنیاد موجود ہے تو اسے سامنے لائیں اور اس سے علمی بحث کا آغاز کریں تاکہ اس بحث کا کوئی علمی فائدہ مرتب ہو اور بحث منطقی طور پر آگے بڑھ سکے۔ ورنہ جزوی واقعات، دور

اَز کار تاویلات اور مرجوح اقوال کے سہارے ایک بات پر ضد کیے چلے جانا عام آدمی کے ذہن میں تو شاید تشویش پیدا کر سکے، علمی دنیا میں اس کا قطعاً کوئی وزن نہیں ہوگا۔

اجتہاد کی اہلیت کا مسئلہ

(مجلہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جولائی ۱۹۹۶ء)

......اجتہاد کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے ایک اور سوال کا جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے اجتہاد کی اہلیت کا مسئلہ جس نے علمائے دین اور جدید اہلِ دانش کے درمیان باقاعدہ ایک تنازعہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔

- مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے بعض خطبات کا سہارا لیتے ہوئے ان کے فرزند جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال اور ان کے ساتھ قانون دانوں کا ایک طبقہ یہ موقف اختیار کیے ہوئے ہے کہ علماء کرام چونکہ آج کے علوم وفنون اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے مسائل اور ان کے اسباب و نتائج سے براہِ راست واقف نہیں ہوتے اس لیے ان میں اجتہاد کی اہلیت نہیں ہے اس لیے اجتہاد کا یہ حق پارلیمنٹ کو منتقل ہو جانا چاہیے۔
- جبکہ علماء کرام کا موقف یہ ہے کہ فقہاء نے شرعی اجتہاد کے لیے جن علوم کی مہارت کو شرط قرار دیا ہے مثلاً قرآن کریم، سنتِ رسولؐ، اجماع امت، اقاویل سلف، علومِ عربیت، چونکہ پارلیمنٹ اور دیگر آئینی ادارے ان علوم سے آگاہی نہیں رکھتے اس لیے ان کے لیے اجتہاد کا حق تسلیم کرنے سے تحریفِ دین کا دروازہ کھل جائے گا۔

ہماری ناقص رائے میں ان دونوں موقفوں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ اجتہاد کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق مجتہد کے لیے ماخذ اور محل دونوں کے ساتھ اجتہادی درجہ کی واقفیت ضروری ہے۔ ماخذ سے مراد وہ علومِ شرعی ہیں جن سے آگاہی کو فقہاء نے اجتہاد کے لیے شرط ٹھہرایا ہے، اور محل سے مراد اس شعبہ زندگی کے مروجہ قواعد وضوابط، روایات اور عرف ہے جس سے متعلقہ مسئلہ درپیش ہے۔ ماخذ اور محل سے کماحقہٗ آگاہی اور ان دونوں کے درمیان تطبیق کی صلاحیت کے تین اجزا سے اجتہاد کا عمل ترتیب پاتا ہے۔ اور اس اجتماعی تناظر میں دیکھا جائے تو دونوں طبقوں

کے موقف کی واقعاتی بنیاد کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود ہے اور ان میں سے کسی ایک کو یکسر نظر انداز کر دینا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہو گا۔......

ڈاکٹر صدیقی صاحب کا مضمون: ایک خدشہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جولائی ۲۰۰۲ء)

''عصرِ حاضر میں اسلامی فکر۔ چند توجہ طلب مسائل'' کے عنوان سے محترم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا مضمون نظر سے گزرا۔ یہ مضمون کم و بیش ربع صدی قبل تحریر کیا گیا تھا لیکن اس کی اہمیت و افادیت آج بھی موجود ہے بلکہ مسائل کی فہرست اور سنگینی میں کمی کے بجائے اس دوران میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے بیشتر مسائل خود میرے مطالعہ کا موضوع رہے ہیں اور بعض مسائل پر کچھ نہ کچھ لکھا بھی ہے، مگر یہ خواہش رہی ہے کہ ایجنڈا اور تجاویز کے طور پر ایسے مسائل کی ایک مربوط فہرست سامنے آجائے جو اس وقت دنیا بھر میں مختلف سطحوں پر ''اسلامائزیشن'' کے حوالے سے زیر بحث ہیں، یا متعدّد حلقوں کی طرف سے ان پر بحث و تمحیص کا تقاضا موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب محترم کا یہ مضمون اس ضرورت کو کافی حد تک پورا کرتا ہے اور اسے اہلِ علم و دانش کے حلقوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔

اب سے تقریبًا پون صدی قبل مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کے عنوان سے اپنے خطبات میں ان اصولی اور علمی مسائل کی نشاندہی کی تھی جن کا جائزہ لینا اسلام کی تعبیر و تشریح کو دورِ جدید کے ناگزیر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ میرے نزدیک علامہ محمد اقبالؒ کے یہ خطبات تجاویز اور ایجنڈے کی حیثیت رکھتے تھے لیکن بدقسمتی سے موافق اور مخالف دونوں حلقوں میں انہیں ایجنڈے کے بجائے موقف کا درجہ دے دیا گیا۔ اول تو ان پر سنجیدگی سے بحث ہی نہیں ہوئی، اور اگر گفتگو کا تھوڑا بہت سلسلہ چلا تو وہ ان خطبات کی حمایت و مخالفت کے دائرہ تک محدود رہا، اور علامہ اقبالؒ ان تجاویز اور ایجنڈے کی صورت میں متعلقہ امور و مسائل پر جس وسیع علمی مباحثہ کی توقع کر رہے تھے، وہ پوری نہ ہوئی۔

مجھے خدشہ ہے کہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے اس مضمون کے ساتھ بھی یہی معاملہ نہ ہو جائے اور ان کی ''تجاویز'' بحث و تمحیص کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے بجائے ''موقف'' قرار پا کر حمایت و

مخالفت کے ایک نئے بازار کو گرم کرنے کا باعث نہ بن جائیں۔ لیکن اس کے باوجود میں اس بات کے حق میں ہوں کہ دینی وعلمی حلقوں میں ان کا یہ مضمون ایک مربوط ایجنڈے کے طور پر بار بار پڑھا جائے، اور اس میں جن مسائل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان پر وسیع تر دائرے میں علمی مباحثہ کا اہتمام ہو، کیونکہ اسی صورت میں ہم پیش آمدہ مسائل پر ایک متفقہ یا کم از کم اکثریتی موقف تک پہنچنے اور ان مسائل کے حوالے سے فکرِ جدید کے چیلنج کا سامنا کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے......

اقبالؒ کا تصورِ اجتہاد

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ نومبر ۲۰۰۶ء)

علامہ محمد اقبالؒ جنوبی ایشیا میں امتِ مسلمہ کے وہ عظیم فکری راہنما تھے جنہوں نے اس خطے پر برطانوی استعمار کے تسلط اور مغربی فکر وثقافت کی یلغار کے دور میں علمی، فکری اور سیاسی شعبوں میں ملتِ اسلامیہ کی راہنمائی کی، اور ان کی ملی جدوجہد کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی نئی نسل اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کو مغرب کے فکر وفلسفہ اور تمدن وثقافت سے مرعوب ہونے اور اس کے سامنے فکری طور پر سپر انداز ہونے سے محفوظ رکھنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ انہوں نے تہذیبِ مغرب کو چیلنج کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ بے لچک وفاداری، اپنے ماضی کے ساتھ وابستگی، اور اپنی اسلامی شناخت کو باقی رکھنے کا سبق دیا۔ اور پھر اس اسلامی شناخت کے جداگانہ وجود کے لیے ایک الگ مسلم ریاست کے قیام کی طرف جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی عملی راہنمائی کی جس کے نتیجے میں ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے نام سے ایک مستقل ملک دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔

یہ اسلام کے اعجاز کا اظہار تھا کہ جب یورپ کو مذہب کے ساتھ ریاست کا تعلق ختم کیے ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا، صدیوں سے چلی آنے والی اسلامی خلافت کے مرکز ترکی نے ریاست اور مذہب کی علیحدگی کے اس تصور کو قبول کر کے سیکولر ہونے کا اعلان کر دیا تھا، اور کم وبیش ساری دنیا میں مذہب کو ریاستی معاملات سے بے دخل کرنے کا عمل تیزی سے جاری تھا، اس طوفانی دور میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے اس آندھی کے مخالف سمت سفر کا آغاز کیا اور خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے صرف دو عشروں کے بعد اسلام کے نام پر اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ایک نیا ملک قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، جسے بلاشبہ علامہ محمد اقبالؒ کی فکری راہنمائی کا کرشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ ایک عظیم فلسفی، مفکر، دانشور اور شاعر تھے جنہوں نے اپنے دور کی معروضی صورتحال کے کم وبیش ہر پہلو پر نظر ڈالی، اور مسلمانوں کو ان کے مستقبل کی صورت گری کے لیے اپنی

سوچ اور فکر کے مطابق راہنمائی مہیا کی۔ وہ پیغمبر اور معصوم نہیں تھے کہ ان کی ہر بات کو الہام اور وحی کے طور پر آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے، اور نہ ہی اس دور کے معروضی حالات جامد و ساکت تھے کہ ان کی بنیاد پر قائم کی جانے والی کسی رائے اور موقف کو حتمی قرار دے دیا جائے۔ البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی دانست اور علمی بساط کی حد تک امتِ مسلمہ کو ملی معاملات میں بھرپور راہنمائی مہیا کرنے کی کوشش کی اور بہت سے امور میں امت کے مختلف طبقات نے اس راہنمائی سے عملی فائدہ اٹھایا۔

علامہ محمد اقبالؒ نے اجتماعی زندگی کے جن میدانوں کو اپنی فکری تگ و تاز کی جولان گاہ بنایا، ان میں ملتِ اسلامیہ کی تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا وہ فکری خلا بھی تھا جو مسلمانوں کے علمی و سیاسی زوال اور اس کے پہلو بہ پہلو مغرب کے سائنسی و صنعتی عروج اور دنیا پر اس کی سیاسی و عسکری بالادستی کے پس منظر میں بہت زیادہ نمایاں دکھائی دینے لگا تھا۔ مسلمانوں کے دورِ عروج میں جہاں وحیٔ الٰہی اور آسمانی تعلیمات یعنی قرآن و سنت کے علوم کی تحقیقات و تشریحات، اور انسانی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ان کے انطباق کا علمی سفر مسلسل جاری تھا، وہاں سائنسی و عمرانی علوم میں ارتقا اور پیشرفت بھی گاڑی کے دوسرے پہیے کا کردار ادا کر رہی تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اندلس کے مغرب کے سامنے سپر انداز ہو جانے کے بعد قائم ہونے والی دو بڑی مسلم سلطنتوں خلافتِ عثمانیہ اور مغل سلطنت کو عمرانیات اور سائنس و ٹیکنالوجی کے ساتھ وہ دلچسپی نہیں تھی جو معاصر اقوام کے ساتھ زندگی کے سفر میں برابری اور توازن قائم رکھنے کے لیے ضروری تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم ''ون ویلنگ'' کرتے ہوئے جتنی دیر چل سکے، چلتے رہے، اور جب اس مسابقت کا دوسرا فریق بہت زیادہ آگے نکل گیا تو ہم آہستہ آہستہ لڑھکتے ہوئے غلامی کے کھڈے میں جا گرے۔

یہ بھی اسی المیہ کا ایک حصہ ہے کہ وحیٔ الٰہی اور آسمانی تعلیمات کے انسانی زندگی اور معاشرت کے ساتھ انطباق کے حوالے سے بھی ہم نے اس وقت تک ہو جانے والے علمی کام پر قناعت کر لی، اور مزید پیشرفت کی رفتار اس قدر کم کر دی کہ اس کے مقابل دوسری طرف نظر آنے والی تیز رفتاری کے سامنے وہ بالکل جمود اور سکتہ کا منظر پیش کرنے لگی۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اجتہاد کے بند ہونے کے حوالے سے اپنے خطبے میں جو کچھ کہا ہے، وہ اسی خلا کی نشاندہی ہے، لیکن وہ خود مجتہد اور فقیہ نہیں تھے

اور نہ ہی اجتہاد اور فقہ سے ان کا کبھی عملی واسطہ رہا ہے، اس لیے ایک مفکر اور فلسفی کے طور پر خلا کی نشاندہی اور اسے پُر کرنے کی ضرورت کا احساس دلانے کی حد تک ان کی بات بالکل درست ہے، مگر اس کے عملی پہلوؤں، ترجیحات اور دائرۂ کار کا تعین چونکہ ان کے شعبہ کا کام نہیں تھا، اس لیے اس باب میں ان کے ارشادات پر گفتگو کی خاصی گنجائش موجود ہے، اور یہ گفتگو اس موضوع کا تقاضا بھی ہے۔

بعض روایات کے مطابق علامہ محمد اقبالؒ نے اس حوالے سے علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور دیگر اہلِ علم سے جو توقعات وابستہ کر لی تھیں، اور اس سلسلے میں بعض رابطوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے، میرے خیال میں اس کا پس منظر یہی تھا اور اس ضمن میں ایک روایت مجھ تک پہنچی ہے جس کا اس مرحلہ پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ صاحب ۱۹۴۴ء سے ۱۹۸۲ء تک خطیب رہے اور اس کے بعد سے یہ ذمہ داری میرے سپرد ہے۔ وہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کا دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ سے اختلاف ہوا اور شاہ صاحبؒ نے دار العلوم سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا، تو علامہ محمد اقبالؒ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ شاہ صاحب لاہور آ جائیں کیونکہ فقہ اسلامی کی تجدید کا جو کام ان کے ذہن میں ہے، وہ ان کے خیال میں علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور وہ یعنی علامہ اقبالؒ مل کر کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے کہنے پر لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے اس مقصد کے لیے مسجد اور اس کے ساتھ ایک علمی مرکز تعمیر کرایا گیا جو لاہور کے ایک تاجر خواجہ محمد بخش مرحوم نے، جو آسٹریلیا میں تجارت کرتے تھے، علامہ اقبالؒ کے کہنے پر تعمیر کیے۔ اسی حوالے یہ آسٹریلیا مسجد اور اس کے ساتھ "آسٹریلیا وقف بلڈنگ" کہلاتا ہے۔ مگر علامہ انور شاہ کاشمیریؒ اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور مولانا مفتی عبدالواحدؒ کے بقول اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحبؒ کے لاہور میں ڈیرہ لگانے کی صورت میں دارالعلوم دیوبند کو نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا جو وہ کسی حالت میں نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے لاہور آنے سے انکار کر دیا اور پھر ان کے کہنے پر انہی کے ایک شاگرد حضرت مولانا عبد الحنان ہزارویؒ کو آسٹریلیا مسجد کا خطیب مقرر کیا گیا۔ یہ حالات کے جبر کا ایک پہلو تھا کہ علامہ سید محمد انور شاہ

کشمیریؒ لاہور آنے پر آمادہ نہ ہوئے، ورنہ اپنے وقت کی یہ دو عبقری شخصیات مل کر اس کام کے لیے بیٹھ جاتیں تو آج کی علمی اور فقہی دنیا کا منظر بالکل مختلف ہوتا۔

میرا یہ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ فکری اور نظری طور پر اجتہاد کی ضرورت کا ضرور احساس دلا رہے تھے اور ان کی یہ بات وقت کا ناگزیر تقاضا تھی، لیکن اس کے عملی پہلوؤں کی تکمیل کے لیے ان کی نظر ان علماء کرام پر تھی جو قرآن و سنت کے علوم سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور اجتہاد کی اہلیت سے بہرہ ور تھے، چنانچہ اجتہاد کے بارے میں اپنے خطبہ میں پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کی بات کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ”یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی جدید مسلم مجلسِ آئین کی قانون سازی کے بارے میں جس کی ترکیب کم از کم موجودہ حالات میں ایسے ہی اشخاص سے ہو سکتی ہے جنہیں زیادہ تر قانون اسلام کی باریکیوں کا علم نہیں ہے۔ ایسی مجلسِ آئین ساز قانون کی تشریح کرتے وقت بڑی سخت غلطیوں کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ ہم کسی طرح ایسی تشریحی غلطیوں کے امکانات کی مکمل پیش بندی یا کم از کم انہیں گھٹانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور میں دنیاوی امور سے واقف علمائے مذہب کی ایک علیحدہ کمیٹی بنادی گئی ہے جسے مجلس کے عملِ قانون سازی کی نگرانی اور دیکھ بھال کا اختیار ہوگا۔ میری رائے میں یہ خطرناک التزام شاید ایرانی نظریہ قانون کی رو سے ضروری سمجھ کر کیا گیا ہے۔ اس نظریہ قانون کی رو سے بادشاہ ملک و سلطنت کا محض امین ہے جو درحقیقت امامِ غائب کی ملک ہے۔ علماء، امامِ غائب کے نمائندوں کی حیثیت سے پوری زندگی کی نگرانی اور دیکھ بھال اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اگرچہ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ امامِ غائب کے اس سلسلہ جانشینی کی غیر موجودگی میں وہ کس طرح نیابتِ امام کا حق ثابت کر سکتے ہیں، بہرحال ایران کا دستوری نظریہ چاہے کچھ ہی ہو، یہ التزام خطرے سے خالی نہیں۔ اگر حنفی ممالک میں اس تجربہ کو دہرایا بھی جائے تو وہ محض عارضی اور وقتی ہونا چاہیے... علماء کو خود مجلسِ آئین ساز کا نہایت اہم اور مرکزی عنصر ہونا چاہیے تاکہ قانون سے متعلقہ مسائل پر آزادانہ مباحث کی معاونت و راہنمائی کر سکیں۔ غلط تشریحات کو

روکنے کا مؤثر علاج صرف یہی ہے کہ اسلامی ممالک میں قانون کے رائج الوقت نظامِ تعلیم کی اصلاح کی جائے، اس کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اس کی تحصیل کے ساتھ جدید اصولِ قانون کا گہرا مطالعہ بھی شامل کر دیا جائے۔"

خطبہ اجتہاد کے اس اقتباس کے دیگر بہت سے پہلوؤں سے قطع نظر یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک عملی اجتہاد کا تعلق ہے اور قرآن وسنت کی جدید تعبیر وتشریح کا سوال ہے، وہاں علامہ اقبالؒ علماء کرام ہی کو اس کا بنیادی کردار سمجھتے ہیں، اور اسلامی علوم سے بے بہرہ افراد پر مشتمل پارلیمنٹ سے قرآن وسنت کی تشریح میں بڑی سخت غلطیوں کے ارتکاب کے خطرہ سے وہ نہ صرف پوری طرح آگاہ ہیں بلکہ اس کے علاج کے طور پر علماء کرام کو مجلسِ آئین ساز کے "نہایت اہم اور مرکزی عنصر" کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک "اجتہادِ مطلق" کا تعلق ہے کہ اجتہاد کے لیے اصول وضوابط از سرِ نو وضع کیے جائیں، اس ضمن میں علامہ محمد اقبالؒ اپنے مذکورہ خطبہ میں فرماتے ہیں:

"اس مقالے میں مجھے اجتہاد کے پہلے درجے یعنی اجتہادِ مطلق کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اہلِ سنت اس درجہ اجتہاد کے نظری امکانات کے تو قائل ہیں لیکن جب سے مذاہبِ فقہ کی ابتدا ہوئی ہے، عملی طور پر اسے اس لیے نہیں مانتے کہ مکمل اجتہاد کے لیے جن قیود وشرائط کی حصار بندی کر دی گئی ہے، ان کا کسی ایک فردِ واحد میں مجتمع ہونا قریب قریب ناممکن ہے۔"

میرے خیال میں اگر اس مسئلے کا ایک اور پہلو سے جائزہ لے لیا جائے تو شاید اہلِ سنت کے موقف پر اس اعتراض کی ضرورت باقی نہ رہے۔ وہ یہ کہ "اجتہادِ مطلق" کا دروازہ بند ہو جانے کا تعلق اہلیت وصلاحیت کے فقدان یا شرائط کے مجتمع نہ ہونے سے نہیں بلکہ ضرورت مکمل ہو جانے سے ہے، اس طور پر کہ جس طرح ہر علم اور فن میں بنیادی اصول وضوابط طے ہونے کا تاریخ میں ایک بار ہی موقع آتا ہے، اور جب وہ ایک بار طے ہو جاتے ہیں تو پھر وہ علم ہمیشہ کے لیے انہی بنیادی ضوابط کے حصار کا پابند ہو جاتا ہے اور اس کے لیے بنیادی اصول بار بار وضع نہیں کیے جاتے۔ کسی بھی علم وفن کو دیکھ لیجیے، اس کے چند اساسی قوانین ایسے ہوتے ہیں جو متبدل نہیں ہوتے اور اس علم اور فن کا تمام تر

ارتقائی اساسی قوانین کی روشنی میں ہوتا رہتا ہے۔ ان اساسی قوانین کی دوبارہ تشکیل کا دروازہ اس لیے بند نہیں ہوتا کہ کسی نے اسے بند کر دیا ہے یا اب کسی میں اس کی صلاحیت نہیں رہی، بلکہ اس دروازے کے بند ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اسی طرح قرآن وسنت کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کے اصول وضع ہونے کا ایک دور تھا جب دو چار نہیں بلکہ بیسیوں فقہی مذاہب وجود میں آئے مگر ان میں سے پانچ چھ کو امت میں قبول حاصل ہوا اور باقی تاریخ کی نذر ہو گئے۔ اب کسی نئے فقہی مذہب کے اضافے کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے نہیں کہ اس کا دروازہ کسی نے بند کر دیا ہے یا اس کی صلاحیت واہلیت ناپید ہو گئی ہے، بلکہ اس لیے کہ یہ کام ایک بار مکمل ہو جانے کے بعد اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اور ان مسلّمہ فقہی مذاہب کے اصول وقوانین میں وہ تمام تر گنجائشیں اور وسعتیں موجود ہیں جن کی روشنی میں ہر دور کے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ کے مذکورہ خطبہ کے حوالے سے ایک اور بات کو پیش رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس خطبے کا بیشتر حصہ ترکی کی فکری اور دستوری نشاۃِ ثانیہ کے پس منظر میں ہے، جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ کا یہ خیال اس خطبے میں صاف طور پر جھلکتا ہے کہ شاید یہ اجتہاد کا عمل تھا جس کے ذریعے ترکی اسلام اور مسلمانوں کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ کا یہ خیال اور تاثر درست نہ تھا، اس لیے کہ جدید ترکی کا یہ عمل اسلام میں اجتہاد کا نہیں بلکہ اس سے انقطاع اور یورپ کی طرح مذہب کو ریاستی معاملات سے کلیتاً بے دخل کر دینے کا تھا، جس کا ردعمل خود ترکی میں سامنے آ چکا ہے اور جس کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ یورپی یونین کی جس رکنیت کے لیے ترکی نے یہ ساری قربانیاں دی تھیں، پون صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ اس کے لیے ابھی تک ایک موہوم خواب ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس مرحلے میں اس تاریخی حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد جب علماء کرام کو نئی ریاست کی دستوری حیثیت کا تعین کرنے کے لیے فیصلہ کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے ماضی کی روایات سے بے لچک طور پر بندھے رہنے کے بجائے وقت کے تقاضوں اور علامہ اقبالؒ کی فکر کا ساتھ دیا، جس کی واضح مثال

- قراردادِ مقاصد اور تمام مکاتبِ فکر کے ۲۲ سرکردہ علماء کرام کے ۳۱ متفقہ دستوری نکات

میں خلافتِ عثمانیہ کے خاندانی اور موروثی نظام کی بحالی پر زور دینے کے بجائے عوام کی رائے اور مرضی کو حکومت کی تشکیل کی بنیاد تسلیم کرنے کی صورت میں موجود ہے۔

- اسی طرح عقیدۂ ختمِ نبوت کے منکر قادیانیوں کو مرتد کا درجہ دے کر فقہی احکام کے مطابق گردن زدنی قرار دینے کے بجائے علامہ اقبالؒ کی تجویز کی روشنی میں غیر مسلم اقلیت کی حیثیت دے کر ان کے جان ومال کے تحفظ کے حق کو تسلیم کرنا بھی ملک کے علماء کا ایک ایسا اجتہادی فیصلہ ہے جس کے پیچھے علامہ محمد اقبالؒ کی فکر کار فرما دکھائی دیتی ہے۔
- جبکہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں پارلیمنٹ کو قرآن وسنت کے اصولوں کی پابندی کی شرط پر قانون سازی کی حتمی اتھارٹی تسلیم کیے جانے کو بھی اسی تسلسل کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

آخر میں علامہ اقبالؒ کے خطبہ اجتہاد کے حوالے سے ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ ماضی کے اجتہادات کو حتمی نہ سمجھا جائے اور ان کے بارے میں نظرِ ثانی کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ اگرچہ اس بارے میں ہم تحفظات رکھتے ہیں، کیونکہ اس بحث کی خاصی گنجائش موجود ہے کہ ماضی کے کون سے اجتہادات میں نظرِ ثانی کی ضرورت ہے اور کون سے اجتہادات میں یہ ضرورت موجود نہیں ہے، مگر ایک بات کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ''خطبہ اجتہاد'' پر بھی تو پون صدی گزر چکی ہے۔ اس پون صدی میں دنیا کے ماحول اور عالمِ اسلام کے حالات میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں، ان پلوں کے نیچے سے بہت سے مزید پانی بہہ چکا ہے، اور یقیناً آج کے معروضی حالات اور ضروریات کا نقشہ وہ نہیں ہے جو پون صدی پہلے کا تھا۔ اس لیے کیا ضروری ہے کہ ہمارے ذہنوں کی سوئیاں ۱۹۳۰ء پر ہی رکی رہیں اور کیا ہم ۲۰۰۶ء کے عالمی تناظر اور بین الاقوامی ماحول میں اپنی ضروریات اور ترجیحات کا از سرِ نو جائزہ نہیں لے سکتے؟

”خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں“

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۰۷ء)

بخاری شریف میں ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم پہلی امتوں کے نقشِ قدم پر چلوگے، حتیٰ کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ (صحرائی جانور) کے بِل میں گھسا ہے تو تم بھی ضرور گھسوگے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! کیا پہلی امتوں سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ”تو اور کون ہے؟“

اس حدیثِ مبارک کی تشریح میں محدثین کرام نے مختلف پہلو ذکر کیے ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ یہود ونصاریٰ نے جس طرح توراۃ، انجیل اور زبور میں تحریفات کا راستہ اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں میں معنوی تبدیلیوں اور خدائی احکام کو اپنی خواہش کے سانچے میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ ان کے الفاظ تک بدل ڈالے اور آسمانی تعلیمات سے انحراف کی جو صورتیں انہوں نے اختیار کیں، مسلمانوں میں بھی ایسے گروہ ہوں گے جو اس ڈگر پر چلیں گے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنی خواہش یا فہم ودانش کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسی طرح کی صورتیں اختیار کریں گے۔

چودہ سو سال کی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے لیے بیسیوں گروہ آئے جنہوں نے قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو نت نئے معانی پہنانے کی کوشش کی اور یہود و نصاریٰ کی یاد تازہ کردی۔ البتہ قرآن وسنت کے الفاظ میں ردوبدل کی سہولت انہیں کبھی حاصل نہیں رہی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت اپنے ذمہ لے کر اس کے ساتھ اس کی عملی تشریح کے طور پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وسنت کو بھی قیامت تک محفوظ رکھنے کا اہتمام کر دیا۔ اس لیے مسلمانوں میں ایسے گروہوں کا سارا زور معنوی تحریف پر صَرف ہوتا چلا آرہا ہے اور علامہ اقبالؒ کے بقول

ع خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

کے مصداق قرآنی تعلیمات ایسے گروہوں کی تحریفی تلبیسات کا مسلسل شکار ہوتی چلی آرہی ہیں۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کا حصہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی غالب اکثریت اور اجتماعی دھارے نے اپنے لیے ''اہل السنۃ و الجماعۃ'' کا ٹائٹل اختیار کر کے اس تحریف و تلبیس کے راستے میں بھی مضبوط اور ناقابلِ شکست دیوار کھڑی کر رکھی ہے کہ سنتِ رسولؐ اور جماعتِ صحابہؓ کو دین کی تعبیر و تشریح کا حتمی معیار تسلیم کر لینے کے بعد کسی ایسی تحریف و تلبیس کا راستہ کھلا نہیں رہ جاتا جس پر چل کر یہود و نصاریٰ کی طرح قرآن و سنت کو من مانے معانی اور خود ساختہ تعبیر و تشریح کا جامہ پہنایا جا سکے۔ البتہ یہ کشمکش مسلسل جاری ہے اور قیامت تک اسی طرح چلتی رہے گی۔......

جدید سیاسی نظام اور اجتہاد

(۲۹ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام ''اقبالؒ کا تصور اجتہاد'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار کے چوتھے اجلاس میں پڑھا گیا)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ ''اقبال کا تصورِ اجتہاد'' کے عنوان سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام یہ تین روزہ سیمینار ایسے وقت میں ہو رہا ہے جبکہ پوری دنیائے اسلام میں اجتہاد کے بارے میں نہ صرف یہ کہ بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے مختلف اور متنوع پہلو اربابِ علم و دانش کی گفتگو کا موضوع بنے ہوئے ہیں، بلکہ مختلف سطحوں پر اجتہاد کا عملی کام بھی پہلے سے زیادہ اہمیت اور سنجیدگی کے ساتھ پیشرفت کر رہا ہے اور امتِ مسلمہ میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔

جنوبی ایشیا میں مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال کو اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے کہ آنے والے دور کی ضرورت کا قبل از وقت اندازہ کرتے ہوئے انہوں نے اجتہاد کی جدید ضروریات اور تقاضوں پر علمی انداز میں بحث کی، اور اپنے معروف ''خطبۂ اجتہاد'' میں اہلِ علم کو ان ضروریات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بحث و تمحیص کا ایک عملی ایجنڈا بھی ان کے سامنے رکھ دیا۔ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے ایک طالب علم کے طور پر علامہ اقبال کے خطبہ اجتہاد کے بارے میں دوسرے بہت سے حضرات کی طرح میرے بھی بعض تحفظات ہیں، لیکن مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی حجاب نہیں ہے کہ تمام تر تحفظات کے باوجود اقبال کا یہ خطبہ اجتہاد آنے والے دور کی ضروریات اور تقاضوں کے پیشِ نظر اجتہاد پر بحث و مباحثہ کے لیے ایک قابلِ توجہ اور لائقِ غور علمی اور عملی ایجنڈا ہے۔ اسی لیے اس کے بعد سے اجتہاد کے جدید تقاضوں کے حوالہ سے جب بھی گفتگو ہوئی ہے، اسے کسی بھی مرحلہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔ اس سے قبل سر سیّد احمد خان مرحوم نے بھی اس رخ پر کام کیا تھا مگر میری طالب علمانہ رائے میں سر سیّد احمد خان اور علامہ اقبال کے کام میں ایک واضح فرق ہے جس نے دونوں کے نتائج کو مختلف بنا دیا ہے۔

سر سیّد احمد خان نے جس دور میں بات کی وہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے علمی اور معاشرتی ڈھانچوں کی ٹوٹ پھوٹ کا زمانہ تھا۔ اس وقت صرف اور صرف تحفظ ہی ہر صاحبِ فکر مسلمان کے ذہن میں تھا اور ہر طرف ایک ہی سوچ تھی کہ جو کچھ بچایا جا سکتا ہو، بچا لیا جائے۔ اس کے لیے روایتی علمی و دینی حلقوں نے اپنے انداز میں اور سر سیّد احمد خان نے اپنے انداز میں محنت کی۔ ظاہر بات ہے کہ تحفظات کے دور میں حساسیت بھی اسی حساب سے بڑھ جاتی ہے اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے سر سیّد احمد خان کے اصل کام کی بجائے ان کے تفردات زیادہ تر موضوعِ بحث بنے اور روایتی دینی حلقوں میں سر سیّد احمد خان کے اصل کام کو پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

جبکہ علامہ اقبال نے اس دور میں بات کی جب ہم غلامی کا ایک دور گزار کر آزادی کی طرف بڑھ رہے تھے، امید کی کرنیں روشن ہونے لگی تھیں اور بہتر مستقبل کے کچھ آثار دکھائی دینا شروع ہو گئے تھے، اس لیے علامہ اقبال کے تفردات کی بجائے ان کے کام کی مقصدیت کی طرف نظریں زیادہ اٹھنے لگیں۔ اور جہاں ان کا خطبہ اجتہاد جدید علمی حلقوں کی توجہات کا مرکز بنا، وہاں روایتی دینی حلقوں کے لیے بھی اسے یکسر نظر انداز کرنا مشکل ہو گیا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ دینی حلقوں نے علامہ اقبال کے خطبہ اجتہاد کو من وعن قبول کر لیا، اس لیے کہ جب خود اس کے بارے میں اپنے تحفظات کا ذکر کر رہا ہوں تو یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جس شدت کے ساتھ سر سیّد احمد خان کے تفردات کو مسترد کر دیا گیا تھا، جس کی وجہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس دور کا مخصوص ماحول تھا، علامہ اقبال کو اس طرح کے شدید ردعمل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بلکہ میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ خود روایتی دینی حلقوں نے اس کے بعد جب اجتہاد کی طرف عملی قدم بڑھایا تو علامہ اقبال کے بیان کردہ دائرے ہی ان کے کام آئے۔

اس تمہید کے ساتھ ''اقبالؒ کا تصورِ اجتہاد'' کے مرکزی عنوان کے سائے میں ''جدید سیاسی نظام اور اجتہاد'' کے موضوع پر اس سیمینار میں اربابِ علم و دانش کے سامنے کچھ طالب علمانہ گزارشات پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

جدید سیاسی نظام میں اجتہاد کے حوالہ سے گفتگو کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں کچھ عرض کروں، اس لیے کہ اس کا کوئی خاکہ سامنے رکھے بغیر جدید سیاسی

نظام کے اجتہادی تقاضوں پر گفتگو کرنا ایک ایسی یکطرفہ بات ہوگی جس سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکے گا۔ اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں میری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ قرآن کریم اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کے چند بنیادی اصول تو بیان کیے گئے ہیں، جن سے ایک اسلامی حکومت کے دائرۂ کار اور حدود کا تعین ہو جاتا ہے، لیکن سیاسی نظام کا کوئی متعیّن ڈھانچہ قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے۔ اسے امت کی صوابدید پر ہر دور کے حالات کے تناظر اور ضروریات کے لیے اوپن چھوڑ دیا گیا ہے جو بہت بڑی حکمت کی بات ہے۔ اس کا مطلب اس اہم کام کو نظر انداز کر دینا نہیں ہے بلکہ ایسا کر کے حالات کے اتار چڑھاؤ، نسلِ انسانی کے معاشرتی ارتقا، زمانہ کے تغیرات اور مختلف علاقوں اور زمانوں کے لوگوں کے مزاج و نفسیات میں پائے جانے والے فطری تنوع کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر قسم کے جائز امکانات کا راستہ کھلا رکھا گیا ہے، جو مسلسل تغیر پذیر انسانی سوسائٹی کے فطری تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ البتہ بنیادی اصول اور حدود قرآن و سنت میں بیان کر دیے گئے ہیں تاکہ کسی دور میں کوئی اسلامی حکومت ان بنیادی مقاصد اور دائرۂ کار سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۴۳ سے آیت ۵۰ تک بنی اسرائیل کے سیاسی نظام کا ذکر کیا ہے اور اس کی حدود بیان فرمائی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے توراۃ اتاری جس میں ہدایت اور نور ہے۔ انبیاء کرامؑ، علماء کرام اور خدا پرست لوگ اس کے مطابق حکم کرتے تھے۔ پھر ہم نے انجیل نازل کی جو توراۃ کے احکام کی تصدیق کرنے والی ہے، اور پھر قرآن کریم کا نزول ہوا۔ انہی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہیں کرتے، وہ ظالم، فاسق اور کافر ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ان آیات میں جناب نبی اکرمؐ کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے کریں اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ اور یہ فرمانِ خداوندی بھی انہی آیات میں موجود ہے کہ لوگوں کی خواہشات کو فیصلوں کی بنیاد بنانا جاہلیت اور گمراہی کا ذریعہ ہے۔ پھر یہیں یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ لوگوں کی خواہشات کی مطلقاً نفی نہیں ہے بلکہ "ولا تتبع اھوائھم عما جائک من الحق" (المائدہ ۴۸) کا جملہ واضح کرتا ہے کہ لوگوں کی ان خواہشات

کی پیروی سے منع کیا گیا ہے جو حق یعنی وحیٔ الٰہی سے متصادم ہوں۔ اس کے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی سامنے رکھ لیں جو بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہوا ہے کہ: ’’بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کرام علیہم السلام کرتے تھے، ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا، اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اس لیے میرے بعد خلفاء ہوں گے۔‘‘

گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں وحیٔ الٰہی کی بنیاد پر انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے چلنے والے حکومتی نظام کا تسلسل اب بھی قائم ہے، البتہ اب چونکہ کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیے یہ تسلسل اب خلفاء کے ذریعے آگے بڑھے گا اور یہی اسلام کا نظامِ خلافت ہے۔

نظامِ خلافت کے حوالے سے ایک اہم بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جس کی طرف علامہ محمد اقبال نے اپنے خطبہ میں اشارہ کیا ہے کہ اہلِ سنت کے نزدیک یہ نظام ’’خلافت‘‘ کے عنوان سے ہے، جبکہ اہلِ تشیع اسے ’’امامت‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور میرے خیال میں ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ:

۱. ’’خلافت‘‘ کی بنیاد نامزدگی پر نہیں بلکہ امت کی صوابدید اور اختیار پر ہے۔ جبکہ ’’امامت‘‘ منصوص ہے اور نامزدگی کے ذریعے اس کا تعین ہوتا ہے۔
۲. ’’خلافت‘‘ کسی خاندان اور نسل میں محدود نہیں۔ جبکہ ’’امامت‘‘ صرف ایک خاندان میں محدود ہے۔
۳. ’’خلیفہ‘‘ کا دینی درجہ مجتہد کا ہے جس کے فیصلوں اور احکام میں صواب اور خطا دونوں کا احتمال موجود رہتا ہے۔ جبکہ ’’امام‘‘ معصوم ہے، اس کی رائے میں خطا کا احتمال نہیں اس لیے کسی بھی معاملہ اس کی رائے حتمی ہوتی ہے۔
۴. ’’خلیفہ‘‘ اپنی خلافت میں خدا کی نمائندگی نہیں کرتا۔ جبکہ ’’امام‘‘ خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو ’’خلیفۃ الرسول‘‘ کہا جاتا تھا۔ قاضی ابو یعلیٰؒ نے ’’الاحکام السلطانیہ‘‘ میں روایت نقل کی ہے کہ ایک بار کسی شخص نے حضرت ابوبکرؓ کو ’’یا خلیفۃ اللہ‘‘ کہہ کر پکارا تو خلیفۂ اول نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں بلکہ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ میری طالب علمانہ رائے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خدا کی نمائندگی کے نام پر کوئی

پاپائی اختیارات نہیں رکھتا بلکہ رسول اللہ کے نمائندہ کے طور پر ان کی ہدایات اور تعلیمات کا پابند ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد پہلے خطبہ میں صاف طور پر فرمادیا کہ میں اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے، اور اگر ایسا نہ کروں تو میری اطاعت تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔ اسے دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ یہ تھیاکریسی کی نفی تھی اور شخصیت کی بجائے دلیل کی حکومت کے قیام کا اعلان تھا جس سے اسلام کے نظامِ خلافت آغاز ہوا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اہلِ سنت کے موقف اور روایات کے مطابق) اپنا جانشین نامزد نہیں کیا تھا بلکہ خلیفہ کے انتخاب کو امت کی صوابدید اور اختیار پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک موقع پر خلیفہ نامزد کرنے کا ارادہ فرمایا لیکن پھر یہ کہہ کر ارادہ ترک کر دیا کہ "یابی اللہ و المومنون الا ابابکر" ابوبکر کے سوا کسی اور کو خلیفہ بنانے سے اللہ تعالیٰ بھی انکار کرتا ہے اور مومنین بھی اس پر راضی نہیں ہوں گے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے امت کی اجتماعی صوابدید پر اعتماد کا اظہار تھا، اور حکمت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کسی کو نامزد کر کے نامزدگی کو ہمیشہ کے لیے قانون نہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا فیصلہ عوامی رائے بلکہ اچھے خاصے عوامی بحث و مباحثہ کے بعد ہوا، اور اس طرح امت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے حکمران کا خود انتخاب کرے۔

اس کے ساتھ اگر مسلم شریف کی ایک اور روایت کو بھی پیشِ نظر رکھ لیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تمہارے اچھے حکمران وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم ان سے محبت کرو، اور تمہارے برے حکمران وہ ہیں جو تم سے نفرت کریں اور تم ان سے نفرت کرو''۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ حاکم اور رعیت کے درمیان اعتماد کا رشتہ ضروری ہے، البتہ اس اعتماد کے اظہار کی عملی صورت ہر زمانہ کے حوالہ سے مختلف ہو سکتی ہے۔

اس لیے قرآن پاک اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل کے حوالہ سے اسلامی حکومت کی تین بنیادیں نظر آتی ہیں:

۱. حکومت کا قیام عوام کی مرضی سے ہو گا۔

۲.   خلیفہ کو استبدادی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے بلکہ وہ قرآن و سنت کے احکام کا پابند ہوگا۔

۳.   قرآن وسنت کے صریح احکام کے مقابلہ میں عوامی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ اگر حضرت ابوبکرؓ کے پہلے خطبہ کا یہ جملہ شامل کر لیا جائے کہ ''اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو'' تو اس سے ایک اور اصول بھی اخذ ہوتا ہے کہ:

۴.   حکومت عوام کے سامنے جوابدہ ہے، اور عوام کو حکومت کے احتساب کا حق حاصل ہے۔

ان اصولوں کی وضاحت کے بعد اب میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ خلیفہ کے انتخاب کے طریق کار، حکومتی ڈھانچہ، اور عوام کے حقِ احتساب کو عملی شکل دینے کے تمام امور حالات پر چھوڑ دیے گئے ہیں، اور اس کے لیے ہر دور میں اس وقت کے حالات اور ضروریات کے مطابق کوئی بھی طریق کار اختیار کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے چودہ سو سالہ تعامُل میں مختلف طرز ہائے حکومت کو عوامی اور علمی حلقوں کی طرف سے جواز کا درجہ اور سند حاصل ہوتی رہی ہے۔

اس کے بعد میں آج کے جدید سیاسی نظام کی طرف آتا ہوں جس کی بنیاد چار اہم اصولوں پر ہے:

۱.   مذہب اور ریاست کی علیحدگی،

۲.   عوامی رائے کی بنیاد پر حکومت کی تشکیل،

۳.   پارلیمنٹ کی مطلق خود مختاری،

۴.   انسانی حقوق کی پاسداری۔

جہاں تک مذہب اور سیاست میں علیحدگی کی بات ہے، اسلام اس کو تسلیم نہیں کرتا، اور قرآن کریم صراحت کے ساتھ یہ بات کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے فرامین کو بنیاد بنائے بغیر احکام دیے جائیں گے تو وہ گمراہی کا باعث اور جاہلیت کے مترادف ہوں گے۔ البتہ حکومت کے قیام کے لیے عوام کی رائے کا حق اسلام نے تسلیم کیا ہے، بلکہ آج کے جدید سیاسی نظام کے وجود میں آنے سے ایک ہزار سال قبل عوامی رائے کی بنیاد پر حکومت تشکیل دے کر اس کو بطور اصول اختیار کیا ہے۔

پارلیمنٹ کا وجود بھی اسلام کے اصولوں سے مطابقت رکھتا ہے، کیونکہ جناب نبی اکرمؐ اور خلفائے

راشدین کے دور میں نقابہ اور عرافہ کا تصور اور عریف اور نقیب کا منصب اسی عوامی نمائندگی کی علامت تھے، اور وہ اسلام کے سیاسی نظام کا ایک ناگزیر حصہ تصور ہوتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق خود جناب نبی اکرمؐ نے غزوۂ حنین کے بعد قیدیوں کی واپسی کا فیصلہ متعلقہ لوگوں کی مرضی سے کیا تھا، اور ان کی مرضی معلوم کرنے کے لیے ان کے نمائندوں کو ذریعہ بنایا تھا جنہیں ''عریف'' کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی متعدّد روایات کے مطابق جناب نبی اکرم نے عرفاء اور نقباء کا تذکرہ فرمایا ہے اور ان کی ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ان روایات کو سامنے رکھتے ہوئے آج کے بلدیاتی نظام اور پارلیمنٹری سسٹم کو اس کا متبادل یا اس کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔

البتہ پارلیمنٹ کی مطلق خود مختاری جسے ''ساورنٹی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ محلِ نظر ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام میں پارلیمنٹ قرآن و سنت کی حدود میں ہی قانون سازی کی مجاز ہوتی ہے، چنانچہ اسے قرآن و سنت کے کسی صریح حکم کو منسوخ یا تبدیل کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، اور اس کی خود مختاری مطلقاً نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرمؐ کی ہدایات کے دائرے میں تسلیم کی جائے گی۔

اسی طرح انسانی حقوق کی پاسداری کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے، اس لیے کہ اسلام صرف انسانی حقوق کی بات نہیں کرتا بلکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پاسداری کا ایک مربوط نظام پیش کرتا ہے۔ اور انسانوں کے باہمی حقوق کی عملداری اور نگرانی کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ کی ادائیگی کے اہتمام کو بھی ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۴۱ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمان حکمرانوں کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب ہم انہیں اقتدار عطا کرتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں، امر بالمعروف کرتے ہیں اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ کے ضمن میں تفسیر ابن کثیر میں امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ایک خطبہ کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ ہم حقوق اللہ کے بارے میں بھی تم سے مواخذہ کریں گے اور تمہارے باہمی حقوق کے حوالے سے بھی مواخذہ کریں گے۔

اس لیے ایک مسلم ریاست میں جب حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی کا اہتمام اور نگرانی حکومت کی ذمہ داری قرار پائے گی تو انسانی حقوق کے موجودہ فلسفہ و نظام پر، جس کی بنیاد اقوام متحدہ کے چارٹر پر ہے، نظر ثانی ناگزیر ہو جائے گی۔ کیونکہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی

بنیاد صرف حقوق العباد پر ہے اور اس کے بہت سے قوانین اور ضابطے حقوق اللہ اور وحیٔ الٰہی سے متصادم ہیں۔ اس بنیاد پر اصولی طور پر انسانی حقوق کی پاسداری تو ایک اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے، لیکن ایسا حقوق اللہ کے ساتھ توازن کے ساتھ ہوگا، اور حقوق اللہ کو نظر انداز کر کے صرف حقوق العباد کی پاسداری یکطرفہ اور نامکمل بات ہوگی۔

اس پس منظر میں جب ہم اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے جدید سیاسی تقاضوں کو اس کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کے لیے اجتہادی ضروریات کا جائزہ لیتے ہیں، اور پاکستان کے علماء کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہیں تو اطمینان ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سے صَرفِ نظر نہیں کیا۔ کیونکہ پاکستان کے قیام کے بعد جب علماء کرام کے سامنے ایک نئی اسلامی ریاست کی بنیاد طے کرنے کا مرحلہ آیا تو یہ اجتہادی عمل اور اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع تھا۔ علماء کے سامنے خلافتِ عثمانیہ کا صرف ربع صدی قبل ختم ہونے والا ڈھانچہ بھی تھا، اور سعودی عرب میں اس کے متبادل کے طور پر وجود میں آنے والا حکومتی نظام بھی ان کے پیشِ نظر تھا، لیکن یہ دونوں جدید دور کے سیاسی تقاضوں اور ضروریات کو پورا کرنے والے نہیں تھے۔ اس لیے علمائے پاکستان نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اسلام کے نام پر قائم ہونی والی اس نئی مملکت میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ اور قرآن وسنت کی بالادستی کی شرط کے ساتھ عوام کے ووٹوں سے حکومت کے قیام کا اصول اختیار کیا جائے، عوام کے منتخب نمائندوں کے لیے اقتدار کا حق تسلیم کیا جائے، اور یہ بھی حتمی طور پر طے کر لیا کہ تمام تر قانون سازی پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگی۔ یہی وہ اصول ہیں جن کی طرف علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے خطبہ اجتہاد میں توجہ دلائی تھی، چنانچہ قراردادِ مقاصد کے ساتھ ساتھ تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام کے ۲۲ دستوری نکات اسی اجتہادی پیشرفت کا ثمرہ ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے علماء کرام نے نظامِ حکومت کے بارے میں اجتہادی ضروریات کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور علامہ اقبال کے تصورِ اجتہاد کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

پھر قومی تاریخ کے ایک اور مرحلہ کو بھی اس سلسلے میں سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جب ۱۹۷۳ء کا دستور تشکیل پا رہا تھا، اس وقت دستور ساز اسمبلی میں مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ اور معتمد علماء عوام کے منتخب نمائندوں کی صورت میں موجود تھے جن کی مشاورت و اشتراک کے ساتھ دستور تشکیل

پایا۔ اس دستور کی نظریاتی حیثیت کا تعین، حکومتی ڈھانچے کی نوعیت کا فیصلہ، آج کے عالمی نظام اور جدید سیاسی تقاضوں کے ساتھ اس کی ایڈجسٹمنٹ کے راستے تلاش کرنا، اور ان سب کے ساتھ قرآن وسنت کی بالادستی کے اصول کو برقرار رکھنا بہت بڑا اجتہادی عمل تھا۔ جس میں ہمارے علماء کرام پوری طرح سُرخرو ہوئے اور ایک ایسا دستور قوم کو فراہم کیا جس پر ملک کے تمام طبقوں کے ساتھ ساتھ روایتی دینی حلقوں کا بھی اتفاق ہے، اور جدید سیاسی نظاموں کے ناگزیر تقاضوں کی بھی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح قادیانیت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بھی ملک کے روایتی دینی حلقوں نے اجتہاد سے کام لیا اور اپنے قدیم روایتی موقف پر اصرار کرنے کی بجائے علامہ اقبال کی تجویز کے مطابق قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دینے پر اکتفا کر لیا، اس لیے کہ جدید سیاسی نظام کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا تقاضا یہی تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں حکومتی ڈھانچے اور دستوری نظام کی تشکیل اور قادیانیوں کی حیثیت طے کرنے کے بارے میں ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام نے متفقہ طور پر جو فیصلے کیے، وہ اسی رُخ پر ہوئے ہیں جن کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا، بلکہ ہم نے تو افغانستان میں طالبان کی امارتِ اسلامیہ قائم ہونے کے بعد وہاں بھی اس بات کے لیے کوشش کی ہے کہ کسی طرح وہاں دستوری حکومت کا کوئی راستہ نکل آئے۔ میں خود ایک دور میں قندھار گیا ہوں، امیر المومنین ملا محمد عمر سے ان کے دورِ اقتدار میں ملاقات کی ہے اور اگرچہ ان سے براہ راست اس مسئلہ پر بات نہیں ہو سکی، لیکن ان کی شوریٰ کے ذمہ دار حضرات سے میں نے بات کی۔ میں اپنے ساتھ قراردادِ مقاصد، علماء کے ۲۲ دستوری نکات اور جمعیت علماء اسلام پاکستان کا ۱۹۷۰ء کا انتخابی منشور لے کر گیا تھا، اور میں نے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ علمائے پاکستان کی طرح قرآن وسنت کی بالادستی کی شرط کے ساتھ عوامی نمائندگی اور دستوری حکومت کا اہتمام کریں، کیونکہ آج کے دور میں کسی حکومت کے جواز کو عالمی سطح پر تسلیم کرانے کے لیے یہ ناگزیر تقاضے ہیں۔ اور چونکہ اس کا تعلق اجتہادی امور سے ہے اور حالات کے مطابق ایسے معاملات میں کوئی بھی مناسب فیصلہ کرنے کی گنجائش موجود ہوتی ہے، اس لیے انہیں اس مشورہ پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی تھی یا حالات کا جبر تھا کہ معاملات کو اس رخ پر لانے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

اس کے برعکس ہمارے ایک اور پڑوسی ملک ایران میں جب مذہبی قیادت برسرِاقتدار آئی اور ابھی تک برسرِاقتدار ہے، اس نے اپنے روایتی موقف کو جدید سیاسی تقاضوں کے سانچے میں ڈھالا، دستوری حکومت اور عوامی نمائندگی کا اہتمام کیا، اور باوجودیکہ اہلِ تشیع کا امامت کا سسٹم اہلِ سنت کے خلافت کے سسٹم کی بہ نسبت زیادہ سخت اور تھیاکریسی کے زیادہ قریب ہے، انہوں نے اسے بھی ''ولایتِ فقیہ'' کے عنوان سے دستوری نظام کا حصہ بنا دیا، اس لیے وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

دستور کی حد تک پاکستان میں ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے، اور اگر پاکستان اور ایران کے دساتیر کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ایک اسلامی حکومت کے بارے میں اہلِ سنت کے نقطۂ نظر اور اہلِ تشیع کے نقطۂ نظر کا فرق جدید دستوری زبان اور آج کی سیاسی اصطلاحات میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایران میں چونکہ حکومتی طبقات اور حکومتی نظام چلانے والے افراد اس کے مطابق تعلیم و تربیت بھی رکھتے ہیں، اس لیے انہیں اس کے مطابق ملک کا نظام چلانے میں کوئی دقّت پیش نہیں آرہی۔ مگر ہمارے ہاں مقتدر طبقات اور اسٹیبلشمنٹ پاکستان اور اس کے دستور کی نظریاتی بنیاد کے حوالے سے ابھی تک تذبذب اور گومگو کا شکار ہیں، بلکہ عوامی دباؤ کے تحت قبول کیے جانے والے اس دستور اور اس کی اسلامی دفعات سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ اس لیے پاکستان کا دستور اور اس کی اسلامی دفعات قومی زندگی میں عملی پیشرفت کے مواقع سے ابھی تک محروم ہیں۔

گفتگو کے اختتام سے قبل میں یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ جہاں تک جدید سیاسی نظام کے ناگزیر تقاضوں اور آج کے ورلڈ سسٹم کے تناظر کو سمجھنے اور اس سے ممکنہ طور پر ہم آہنگ ہونے کا تعلق ہے، اس کی اہمیت وضرورت سے نہ تو انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی باشعور اہلِ علم نے کبھی اس سے گریز کیا ہے، لیکن اس کا مطلب اسلام کے اصولوں سے دستبرداری اور قرآن وسنت کی حدود سے تجاوز نہیں ہے۔ اس لیے اجتہاد کا جو تقاضا ہماری ملی اور قومی ضروریات سے تعلق رکھتا ہے اور قرآن وسنت کے اصولوں کی روشنی میں اس میں اجتہاد کی گنجائش پائی جاتی ہے، اس کے لیے ضرور کام ہونا چاہیے اور احکام وقوانین کے حوالے سے اس کا وسیع دائرہ موجود ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں روایتی دینی حلقوں اور

مراکز کی سست روی کا احساس ہے اور میں انہیں ان تقاضوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے گزشتہ ربع صدی سے بساط بھر کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن اجتہاد کے نام پر مغرب کی پیروی اور اس کے فلسفہ وفکر کو قبول کرنے سے ہمیں قطعی طور پر انکار ہے، اس لیے کہ سیاسی نظام کے حوالے سے ان کی آخری منزل بہر حال ریاست اور مذہب کی علیحدگی ہے جس کے لیے مغرب ہم پر مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے، مگر ہمارے لیے وہ کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہے اور اقبالؒ نے بھی یہ کہہ کر ہمیں اسی بات کی تلقین کی ہے کہ

ع جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ترکی میں احادیث کی نئی تعبیر و تشریح

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

برادر مسلم ملک ترکی کے حوالے سے ایک خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے جو اس عریضہ کے ساتھ منسلک ہے کہ اس کی وزارتِ مذہبی امور نے احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام کے پورے ذخیرے کی از سرِ نو چھان بین اور نئی تعبیر و تشریح کے کام کا سرکاری سطح پر آغاز کیا ہے، جو اس حوالے سے یقیناً خوش آئند ہے کہ ترکی نے اب سے کم و بیش ایک صدی قبل ریاستی و حکومتی معاملات سے اسلام اور مذہبی تعلیمات کی لاتعلقی کا جو فیصلہ کیا تھا، یہ اس پر نظر ثانی کا نقطۂ آغاز محسوس ہوتا ہے جس کا بہرحال خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔

ترکی نے خلافتِ عثمانیہ کے عنوان سے صدیوں عالمِ اسلام کی قیادت کی ہے اور اسلام کی سربلندی کے ساتھ ساتھ مسلم معاشرہ میں اس کی ترویج و تنفیذ کے لیے شاندار کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے خلافت اور دینی تعلیمات سے ریاستی سطح پر ترکی کی دستبرداری پر دنیائے اسلام میں عمومی طور پر دل گرفتگی اور صدمہ کا اظہار کیا گیا تھا اور اب تک کیا جا رہا ہے۔

- مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے ترکی کے اس فکری و ثقافتی انقلاب کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے اسباب میں اپنے اس تاثر کا اظہار کیا تھا کہ ترکی قوم اپنے مزاج کے حوالے سے عسکری قوم ہے جو مغربی ثقافت اور اسلام کے درمیان علمی و ثقافتی کشمکش میں علمی و اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لا سکی، جس کی وجہ سے وہ مغرب کی ثقافت و فلسفہ کا علمی و فکری میدان میں مقابلہ کرنے کی بجائے پسپائی پر مجبور ہو گئی۔
- جبکہ مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ ترکی کے علماء و مشائخ اس ''غزوِ فکری'' کی اہمیت کا احساس نہ کر سکے اور اس کی طرف ضروری توجہ دینے کے لیے اپنے اوقات کو فارغ نہ کر سکے جس کی وجہ سے یہ عظیم سانحہ رونما ہوا۔

اس پس منظر میں احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام کے پورے ذخیرے کی از سرِ نو چھان بین

اور ان کی نئی تعبیر وتشریح کے بارے میں ترکی حکومت کے اس فیصلے کو ماضی کی طرف لوٹنے کا نقطۂ آغاز سمجھنے کے باوجود اس سلسلے میں کچھ تحفظات کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اور عالمِ اسلام کے دینی و علمی حلقوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سارے عمل کے پس منظر اور دیگر متعلقات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ترکی کی وزارتِ مذہبی امور کے اس کارِ خیر میں اس سے تعاون کریں۔ چنانچہ مختلف علمی اداروں، شخصیات اور مراکز سے ہم الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی طرف سے بطور تجویز یہ گزارش کر رہے ہیں کہ وہ احادیثِ نبویہ کی درجہ بندی اور تعبیر وتشریح کے لیے محدثین کرام اور فقہائے عظام کی اب تک کی علمی خدمات، احادیثِ نبویہ کے بارے میں مستشرقین اور ان کے خوشہ چینوں کی طرف سے پھیلائے جانے والے شکوک وشبہات، نیز آج کے حالات وضروریات اور ملتِ اسلامیہ کی مسلّمہ علمی حدود کے دائرے میں تعبیرِ نو کے ضروری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک جامع بریفنگ رپورٹ ترکی کی وزارتِ مذہبی امور کو بھجوائیں، جو عربی یا انگلش زبان میں ہو اور اس مسئلے میں ترکی کی وزارتِ مذہبی امور کی ضروری علمی وفکری راہنمائی کی ضرورت پوری کرے۔

امید ہے کہ آنجناب اس تجویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے اور اس سلسلے میں اپنی رائے اور پیشرفت سے ہمیں بھی آگاہ فرمائیں گے۔

شکریہ، والسلام، ابوعمار زاہدالراشدی

۱۲مارچ ۲۰۰۸ء

اسلامی شریعت کی تعبیر وتشریح: علمی وفکری سوالات

(محمد عمار خان ناصر کی تصنیف ''حدود وتعزیرات: چند اہم مباحث'' کا دیباچہ۔
مطبوعہ ماہنامہ الشریعہ، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

نحمده تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ آله واصحابه واتباعه اجمعین۔

مسلم ممالک میں شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ اور اسلامی احکام وقوانین کی عملداری کا مسئلہ جہاں اپنی نوعیت واہمیت کے حوالے سے ہمارے ملی فرائض اور دینی ذمہ داریوں میں شمار ہوتا ہے، وہاں اس کی راہ میں حائل متنوع مشکلات اور رکاوٹوں کے باعث وہ ایک چیلنج کی حیثیت بھی رکھتا ہے، اور مسلم معاشروں میں اس سے نمٹنے کے لیے مختلف اطراف سے کوششیں جاری ہیں۔ ان مشکلات اور رکاوٹوں میں سیاسی، تہذیبی، اقتصادی اور عسکری امور کے ساتھ ساتھ یہ علمی رکاوٹ بھی نفاذِ اسلام کی راہ روکے کھڑی ہے کہ آج کے بین الاقوامی حالات اور جدید عالمی تہذیبی ماحول میں اسلامی احکام و قوانین کی مقامی و بین الاقوامی سطح پر تطبیق کی عملی صورتیں کیا ہوں گی، اور گلوبلائزیشن کی اس فضا میں جبکہ دنیا کی کوئی قوم دوسری اقوام کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، اور اقوامِ عالم میں ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے اور ایک دوسرے کا اثر قبول کرنے کا دائرہ دن بدن وسیع اور ناگزیر ہوتا جارہا ہے، اسلامی احکام وقوانین کی اس کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کی قابلِ قبول اور قابلِ عمل شکل کیا ہو سکتی ہے؟

مسلم ممالک میں اس حوالے سے تین رجحانات عام طور پر پائے جاتے ہیں اور ان کے درمیان امتیاز بلکہ کشاکش دن بدن واضح ہوتی جارہی ہے:

ا۔ آج کے عالمی ماحول، جدید ثقافتی فضا، اور بین الاقوامی مطالبات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اسلامی احکام وقوانین کو اس علمی ورثے اور فقہی ذخیرے کی بنیاد پر بالکل اسی طرح نافذ کر دیا جائے جس طرح وہ ترکی کی خلافتِ عثمانیہ اور جنوبی ایشیا کی مغل سلطنت میں نافذ

تھے، اور جن کی اس وقت تک کی ارتقائی شکل ہمارے پاس ''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' اور ''فتاویٰ عالمگیری'' کی صورت میں موجود ہے۔

۲. اس علمی ورثے اور فقہی ذخیرے کو ایک طرف رکھتے ہوئے جدید عالمی تقاضوں اور بین الاقوامی مطالبات کو سامنے رکھ کر قرآن و سنت، بلکہ بعض حلقوں کے نزدیک صرف قرآن کریم کی بنیاد پر نئی فقہ تشکیل دی جائے اور اسے مسلم ممالک میں قانون سازی کی اساس قرار دیا جائے۔

۳. گزشتہ چودہ سو سال کے علمی ورثے اور فقہی ذخیرے سے ترکِ تعلق اور اس سے براءت کا اظہار کرنے کی بجائے اسی کی بنیاد پر اور اس کے مسلّمہ اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے نئے مسائل کا حل تلاش کیا جائے، جدید قانون سازی کے تقاضوں کی تکمیل کی جائے، اور جن بین الاقوامی مطالبات اور تقاضوں کو پورا کرنے کی عملی صورتیں اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے نکالی جا سکتی ہیں، ان سے گریز نہ کیا جائے۔

پورے عالمِ اسلام میں ان تین حوالوں سے علمی کام جاری ہے اور ہر حلقہ اپنی سوچ کو آگے بڑھانے کے لیے تگ و تاز میں مصروف ہے۔ راقم الحروف خود کو اس تیسرے حلقے میں شمار کرتا ہے اور پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ پہلی دونوں صورتیں غیر متوازن اور غیر عملی ہیں۔ اس لیے کہ نہ تو یہ ممکن ہے کہ ہم آج کے عالمی ماحول کو کلیتاً نظر انداز کر دیں اور جدید بین الاقوامی تمدنی تقاضوں سے آنکھیں بند کرتے ہوئے دو سو سال قبل کے اجتہادی فیصلوں اور عمل کو آج کے لیے بھی مکمل طور پر واجب العمل قرار دے دیں۔ اور نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ ہم امتِ مسلمہ کے چودہ سو سالہ اجماعی تعامل، فقہائے امت کی علمی کاوشوں، اور دنیا بھر کے مسلم معاشروں میں اسلامی احکام و قوانین کی حکمرانی کے کم و بیش ایک ہزار سالہ تسلسل کو بین الاقوامیت کے جدید ماحول کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے قرآن کریم یا قرآن و سنت کی نئی تعبیر و تشریح کرنے بیٹھ جائیں، کیونکہ ایسا کوئی بھی عمل مسلّمہ اسلامی اصولوں کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ امتِ مسلمہ کی غالب ترین اکثریت کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں ہوگا، اور اس کا عملی نتیجہ مسیحیت میں مارٹن لوتھر کی پراٹسٹنٹ تحریک کی طرح سوسائٹی کو دین سے کلیتاً لاتعلق کر دینے کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لیے راقم الحروف کے نزدیک

اسلامی قوانین واحکام کی تعبیر وتشریح کے لیے صحیح، قابلِ عمل اور متوازن راستہ یہ ہے کہ:

- امتِ مسلمہ کے اجماعی تعامُل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلّمات کے دائرہ کی بہرحال پابندی کی جائے۔
- امتِ مسلمہ کی غالب اکثریت کی فقہی وابستگیوں کا احترام کرتے ہوئے ہر ملک میں وہاں کی اکثریت کے فقہی رجحانات کو قانون سازی کی بنیاد بنایا جائے، البتہ قانون سازی کو صرف اسی دائرے میں محدود رکھنے کی بجائے دوسری فقہوں سے استفادہ یا بوقتِ ضرورت قرآن وسنت سے براہ راست استنباط کا دروازہ بھی کھلا رکھا جائے۔ مثلاً انڈونیشیا میں شوافع کی اکثریت ہے تو اس اکثریت کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ ان کے ملک میں قانون سازی کی بنیاد فقہ شافعی پر ہو، کیونکہ یہ ایک اصولی اور معقول بات ہونے کے علاوہ وہاں کی اکثریتی آبادی کا جمہوری حق بھی ہے۔
- جدید عالمی ثقافتی ماحول اور گلوبلائزیشن سے پیدا ہونے والے مسائل اور بین الاقوامی مطالبات اور تقاضوں کو نہ تو حق اور انصاف کا معیار تصور کیا جائے کہ ہم ہر تقاضے کے سامنے سپرانداز ہوتے چلے جائیں، اور اس کے لیے اسلامی اصولوں اور احکام سے دستبرداری یا ان کی مغرب کے لیے قابلِ قبول توجیہ وتعبیر ہی ہماری علمی کاوشوں کا ہدف بن کر رہ جائے۔ اور نہ ہی ہم انہیں یکسر نظرانداز کرتے ہوئے نفاذِ اسلام کے لیے اپنی پیشرفت کا راستہ خود ہی روکے کھڑے رہیں۔ بلکہ جن مطالبات اور تقاضوں کو ہم قرآن و سنت کی تعلیمات، اہلِ سنت کے علمی مسلّمات اور اجتہادِ شرعی کے دائرے میں قبول کر سکتے ہیں انہیں کھلے دل سے قبول کریں، اور جو امور قرآن و سنت کی نصوصِ صریحہ اور اجتہادِ شرعی کے مسلّمہ اصولوں سے متصادم ہوں، ان کے بارے میں کسی قسم کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے بغیر پوری دلجمعی کے ساتھ ان پر قائم رہیں۔

اس پس منظر میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نفاذِ شریعت اور اسلامی قوانین واحکام کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے مختلف اطراف میں جو کام ہو رہا ہے، اس کے بارے میں بھی کچھ اصولی گزارشات ضروری سمجھتا ہوں:

۱. صرف قرآن کریم کو قانون سازی کی بنیاد بنانا اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قانون سازی کا ماخذ تسلیم نہ کرنا قطعی طور پر ناقابلِ قبول اور خود قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔

۲. سنتِ رسول سے مراد وہی ہے جو امتِ مسلمہ چودہ سو سال سے اس کا مفہوم سمجھتی آرہی ہے، اور اس سے ہٹ کر سنت کا کوئی نیا مفہوم طے کرنا اور جمہور امت میں اب تک سنت کے متوارث طور پر چلے آنے والے مفہوم کو مسترد کر دینا بھی عملاً سنت کو اسلامی قانون سازی کا ماخذ تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے۔

۳. ایک رجحان آج کل عام طور پر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ سنت مستقل ماخذِ قانون نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ثانوی ہے، اور قرآن کریم کے ساتھ اس کی مطابقت کی صورت میں ہی اسے احکام وقوانین کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بظاہر بہت خوبصورت بات ہے لیکن اس صورت میں اصل اتھارٹی سنت نہیں بلکہ مطابقت تسلیم کرنے یا نہ کرنے والے کا ذہن قرار پاتا ہے کہ وہ جس سنت کو قرآن کریم کے مطابق سمجھ لے وہ قانون کی بنیاد بن سکتی ہے، اور جس سنت کو اس کا ذہن قرآن کریم کے مطابق قرار نہ دے وہ احکام وقوانین کی بنیاد نہیں بن سکتی۔

یہاں ایک بات یہ بھی مغالطہ کا باعث بنتی ہے کہ قرآن کریم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں مطابقت کے لیے عقلِ عام کو معیار تسلیم کر لیا جائے تو معاملہ قرینِ قیاس ہو جاتا ہے، مگر یہ سراسر مغالطہ ہے، اس لیے کہ عقلِ عام کی بنیاد میسر معلومات، مشاہدات اور تجربات پر ہوتی ہے جن کے دائرے زمان ومکان دونوں حوالوں سے تغیر پذیر رہتے ہیں۔ اس لیے عقلِ عام کو قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح، یا ان کے درمیان تطبیق وتوفیق کا حتمی معیار قرار دینے کا مطلب قرآن وسنت کو کسی ایک دور یا علاقہ کی عقلِ عام کا پابند بنا دینے، یا ہر زمانہ اور علاقہ کے لیے الگ الگ تعبیر وتشریح کا دروازہ کھول دینے کے مترادف ہوگا۔ اس لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ سنت کو ثانوی درجہ کا ماخذ قانون قرار دینے کی بجائے اسلامی قانون سازی کا مستقل ماخذ اور قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کا حتمی معیار تسلیم کیا جائے، جیسا کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے دور میں ہوتا تھا اور اسی پر امتِ مسلمہ کا اجماعی تعامل چلا آرہا ہے۔

البتہ ان حدود کی پابندی کی یہ بات فیصلہ کے مراحل کی ہے، اور میرے نزدیک علامہ محمد اقبالؒ کی

طرف سے قانون سازی کے لیے منتخب پارلیمنٹ کو حتمی اتھارٹی قرار دینے کی تجویز کا ایک افادی پہلو یہ بھی ہے کہ رائے عامہ کو مسترد کر کے کسی ایک گروہ کی رائے کو مسلط کر دینے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ جس کا تجربہ ہم پاکستان میں اس طرح کر چکے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک عرصہ تک سنتِ نبوی کو نظر انداز کر کے صرف قرآن کریم کو قانون سازی کا ماخذ قرار دینے کی تحریک چلتی رہی اور اس کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر بہت محنت کی گئی۔ لیکن جب عوام کی منتخب دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۷۳ء میں قانون سازی کی دستوری بنیادیں طے کیں تو اس کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ موجود نہیں تھا کہ وہ رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے قرآن و سنت، دونوں کو قانون سازی کی بنیاد کے طور پر تسلیم کرے۔ بلکہ اگر کسی معاملے میں پارلیمنٹ نے بھی عوام کی جمہوری رائے اور رجحانات کو نظر انداز کیا ہے تو رائے عامہ نے اسے قبول نہیں کیا، جیسا کہ مروجہ عائلی قوانین کو اگرچہ پارلیمنٹ نے قبول کر رکھا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی قرآن و سنت سے متصادم شقوں کے بارے میں آج بھی عوام کی غالب اکثریت اپنے سابقہ رجحانات پر قائم ہے اور ذہنی طور پر انہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس لیے مجھے اس بارے میں کوئی شبہہ یا پریشانی نہیں ہے کہ جب بھی حتمی فیصلہ کا مرحلہ آئے گا، عوام کے جمہوری اور اکثریتی رجحانات کو نظر انداز کر دینا کسی کے بس میں نہیں ہوگا، اور نہ ہی ان سے ہٹ کر کیا جانے والا کوئی فیصلہ امتِ مسلمہ کو باور کرایا جا سکے گا۔ البتہ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے علمی بحث و مباحثہ کا میدان محدود نہیں رہنا چاہیے اور نہ ہی ماضی میں اہلِ علم کے ہاں اس کا دائرہ کبھی تنگ رہا ہے۔ ہماری علمی روایت یہ چلی آ رہی ہے کہ کسی بھی مسئلہ پر بحث و مباحثہ ہمیشہ کھلے دل و دماغ سے کیا گیا ہے، مسئلہ کے ہر پہلو پر بات ہوئی ہے، تجزیہ و تنقیح کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا، اور استدلال و استنباط کی کوئی گنجائش ادھوری نہیں رہنے دی گئی۔ کیونکہ جس طرح کسی مقدمے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے تفتیش کے کسی امکانی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کسی علمی مسئلے میں صحیح نتیجے تک رسائی کے لیے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو کھنگالنا بھی ضروری ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے میں اہلِ علم میں بحث و مباحثہ کے لیے کھلے ماحول کو پسند کرتا ہوں اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہوں۔

عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلّمہ نے جب حدود و تعزیرات کے حوالے سے اپنی کاوش اس کتابچہ کی صورت میں پیش کی، جو اسلامی نظریاتی کونسل نے شائع کیا ہے، تو مجھے اس کے تمام

مندرجات سے اتفاق نہیں تھا، لیکن اس نوعیت کے مسائل میں علمی بحث و مباحثہ کے کھلے ماحول کو میں نے ہمیشہ نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ اسے ضروری بھی سمجھتا ہوں، جیسا کہ مجھ سے مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے ”خطبۂ اجتہاد“ کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ بطور موقف اور فیصلے کے میں اسے قبول نہیں کرتا، لیکن بحث و مباحثہ کی بنیاد اور ایجنڈے کے طور پر اس کا احترام کرتا ہوں اور اس میں اٹھائے گئے نکات پر سنجیدہ علمی بحث و مباحثہ کی حمایت کرتا ہوں۔

آج کے نوجوان اہلِ علم جو اسلام کے چودہ سو سالہ ماضی اور جدید گلوبلائزیشن کے ثقافتی ماحول کے سنگم پر کھڑے ہیں، وہ نہ ماضی سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں اور نہ مستقبل کے ناگزیر تقاضوں سے آنکھیں بند کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماضی کے علمی ورثہ کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے قدیم و جدید میں تطبیق کی کوئی قابلِ قبول صورت نکل آئے۔ مگر انہیں دونوں جانب سے حوصلہ شکنی کا سامنا ہے اور وہ بیک وقت قدامت پرستی اور تجدد پسندی کے طعنوں کا ہدف ہیں۔ مجھے ان نوجوان اہلِ علم سے ہمدردی ہے، میں ان کے دکھ اور مشکلات کو سمجھتا ہوں، اور ان کی حوصلہ افزائی کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتا ہوں، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امت کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلّمات کا دائرہ کراس نہ ہو، کیونکہ اس دائرے سے آگے بہرحال گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے۔

عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلّمہ نے اسی علمی کاوش کا سلسلہ آگے بڑھایا ہے اور زیادہ وسیع تناظر میں حدود و تعزیرات اور ان سے متعلقہ امور و مسائل پر بحث کی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ہر پہلو سے اتفاق کیا جائے، البتہ اس علمی کاوش کا یہ حق ضرور بنتا ہے کہ اہلِ علم اس کا سنجیدگی سے جائزہ لیں، بحث و مباحثہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے مثبت و منفی پہلوؤں پر اظہارِ خیال کریں، اور جہاں کوئی غلطی محسوس کریں اسے انسانی فطرت کا تقاضا تصور کرتے ہوئے علمی مواخذہ کا حق استعمال کریں تاکہ صحیح نتیجے تک پہنچنے میں ان کی معاونت بھی شامل ہو جائے۔

میں دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت عزیزم عمار سلّمہ کی اس کاوش کو حق تک رسائی کا ذریعہ بنائیں اور آج کے دور میں نفاذِ اسلام کے حوالے سے درپیش علمی و فکری چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے ہم سب کو اپنا اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات اور فکرِ اقبالؒ

یکم دسمبر ۲۰۱۲ء کو لاہور میں شاہ ولی اللہ سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک فکری نشست کا انعقاد سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر محمود الحسن عارف کی زیر صدارت ہوا جس میں مختلف اصحابِ دانش نے ''فکرِ اقبالؒ، شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں'' کے عنوان پر اظہارِ خیال کیا۔ مقررین میں پروفیسر محمد اکرم چغتائی، پروفیسر حافظ سعد اللہ، ظہیر الدین بابر ایڈووکیٹ، جناب محمد فرہاد اور دیگر حضرات شامل تھے۔ راقم الحروف نے اس موقع پر جو معروضات پیش کیں ان کا خلاصہ نذرِ قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور علامہ اقبالؒ جنوبی ایشیا کے ممتاز مسلمان مفکرین میں سے تھے۔ دونوں کے درمیان دو صدیوں کا فاصلہ ہے اور دونوں نے اپنے اپنے دور میں ملتِ اسلامیہ کی بیداری کے لیے نمایاں فکری اور سیاسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کا دور وہ ہے جب اورنگزیب عالمگیرؒ کی نصف صدی کی حکمرانی کے بعد مغل اقتدار کے دورِ زوال کا آغاز ہو گیا تھا، اور شاہ ولی اللہؒ کو دکھائی دے رہا تھا کہ ایک طرف برطانوی استعمار اس خطہ میں پیش قدمی کر رہا ہے اور دوسری طرف جنوبی ہند کی مرہٹہ قوت دہلی کے تخت کی طرف بڑھنے لگی ہے۔ جبکہ علامہ اقبالؒ کو اس دور کا سامنا تھا جب انگریزوں کی غلامی کا طویل عرصہ گزارنے کے بعد برصغیر کے باشندے اس سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ گویا شاہ ولی اللہؒ غلامی کے امکانات کو دیکھتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے، اور علامہ اقبالؒ غلامی کو بھگتتے ہوئے اس سے قوم کو آزادی دلانے کی جدوجہد میں مصروفِ عمل تھے۔

شاہ ولی اللہؒ کو یہ خطرہ درپیش تھا کہ جنوبی ہند کے مرہٹے دہلی کے اقتدار کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ اس کا سدِباب انہوں نے یوں کیا کہ افغانستان کے فرمانروا احمد شاہ ابدالیؒ کو برصغیر کے مسلمانوں کی مدد کے لیے دعوت دی، جس کے نتیجے میں پانی پت کی خوفناک جنگ میں مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور شمالی ہند مسلمانوں کے لیے محفوظ ہو گیا۔ جبکہ علامہ اقبالؒ اس پریشانی سے دوچار تھے کہ برطانوی استعمار سے آزادی کے بعد اس خطے کا مستقبل ووٹ اور سیاسی عمل کے ذریعہ تشکیل

پائے گا، جس میں ہندو کی واضح اکثریت مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو مخدوش کر سکتی ہے۔ اس کا حل انہوں نے پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی الگ ریاست کی شکل میں نکالا اور برصغیر کی تقسیم کی تجویز پیش کر کے مسلمانوں کو سیاسی طور پر محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ گویا خطرہ دونوں کو ایک ہی طرح کا درپیش تھا لیکن دونوں نے اس کا حل اپنے اپنے دور کے تقاضوں اور حالات کی روشنی میں الگ الگ تجویز کیا۔

شاہ ولی اللہؒ کو اپنے دور میں فقہی جمود کا سامنا تھا اور اس جمود کو توڑنے کے لیے انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کو قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ کرنے کی دعوت دی بلکہ قرآن کریم اور حدیثِ نبویؐ کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، اور فقہ میں انہوں نے فقہ حنفی کے اصولی دائرہ کو قائم رکھتے ہوئے توسّع اور اجتہاد کو فروغ دینے کی بات کی۔

علامہ اقبالؒ کو بھی اسی قسم کے فقہی جمود سے سابقہ تھا، انہوں نے اپنے طور پر اس کا حل یہ نکالا کہ مسلمان ''اجتہادِ مطلق'' کے دور کی طرف واپس لوٹ جائیں۔ چنانچہ ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کے عنوان سے اپنے خطابات میں انہوں نے اہلِ علم و دانش کو اسی بات کی دعوت دی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے یہ خطبات دینی حلقوں میں ایک عرصہ سے زیر بحث ہیں، ان کے بارے میں بہت سے تحفظات کا اظہار کیا جاتا ہے اور خود میرے بھی بعض تحفظات ہیں، لیکن میرے خیال میں اسے اس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ علامہ اقبالؒ نے یہ خطبات بحث و مباحثہ کے ایجنڈے کے طور پر پیش کیے تھے جن پر علمی و تحقیقی کام نہیں ہو سکا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ خود علومِ قرآن و حدیث کے متبحر عالم تھے، انہیں اپنے لائق فرزندوں اور قابلِ فخر شاگردوں کی صورت میں علمی کام کرنے والی ایک مضبوط ٹیم میسر تھی، اس لیے ان کے ایجنڈے نے ایک باقاعدہ علمی حلقے کی شکل اختیار کر لی اور جنوبی ایشیا کی دینی فکر پر ابھی تک اسی کا سکہ چل رہا ہے۔ مگر علامہ اقبالؒ کو یہ سہولت میسر نہ ہو سکی اور وہ اس معاملہ میں بالکل تنہا نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا ایک دور میں یہ خیال تھا کہ اگر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ لاہور آجائیں تو وہ دونوں مل کر اس علمی و فکری ایجنڈے کو ایک مستقل علمی و فکری کام کی بنیاد بنا سکتے ہیں، اور میری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو آج کی علمی و فکری دنیا کا نقشہ ہی مختلف ہوتا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ پھر علامہ اقبالؒ

نے سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے علماء کرام کو اس طرف آمادہ کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوسکی، حتیٰ کہ پٹھانکوٹ میں دار الاسلام کا قیام اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وہاں آمد بھی بنیادی طور پر علامہ اقبالؒ کی سوچ کا نتیجہ لگتی ہے لیکن کام اس رخ پر آگے نہ بڑھ سکا جو علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر تھا۔

یہ بات درست ہے کہ فقہی جمود کو ختم کرنے اور آزادیٔ فکر کو اجتہاد کے ذریعہ نشوونما دینے کی جو صورت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سامنے تھی، علامہ اقبالؒ کی آزادیٔ فکر اور اجتہاد کے دائرے اس سے مختلف تھے۔ لیکن دونوں کے توسّع اور آزادیٔ فکر کے دائرے بہت مختلف ہونے کے باوجود بنیادی طور پر دونوں کو ایک ہی مسئلہ کا سامنا تھا کہ امت کو اس بے لچک فقہی جمود کے دائرے سے نکالا جائے جو فکری اور علمی ارتقا اور سماجی ترقی میں ان کے خیال میں رکاوٹ تھے۔ البتہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا تصورِ اجتہاد اور فکری آزادی مسلّمہ فقہی اصولوں کی حدود میں تھی جبکہ علامہ اقبالؒ انہی مسلّمہ فقہی اصولوں پر نظرِ ثانی کی بات کر رہے تھے۔ میرا یہ خیال ہے کہ اگر علامہ اقبالؒ کو شاہ ولی اللہؒ کی طرح کی علمی ٹیم اور مواقع میسر آجاتے تو ان کی فقہی سوچ کے بارے میں دینی حلقوں کے تحفظات یقیناً توازن کی صورت اختیار کر لیتے، لیکن ان کے خطبات صرف ایجنڈا ہی رہے اور اس ایجنڈے پر علمی و تحقیقی کام کا خواب تعبیر کی شکل اختیار نہ کرسکا۔ مجھے اس موقع پر آغا شورش کاشمیری مرحوم کا یہ جملہ یاد آرہا ہے جو ان کا اپنا ہے یا شاید کسی اور دانشور کے قول کے طور پر انہوں نے نقل کیا تھا کہ ”اقبالؒ وہ شبلی نعمانیؒ ہے جسے کوئی سید سلیمان ندویؒ میسر نہ آسکا۔“

میرے نزدیک فکرِ اقبالؒ کا اصل المیہ یہی ہے، اور اس کا حل آج بھی یہی ہے کہ اقبالؒ اور انور شاہؒ مل کر بیٹھیں اور قدیم اور جدید ایک دوسرے کی نفی کرنے کی بجائے ایک دوسرے کا وجود اور ضرورت تسلیم کرتے ہوئے باہمی مشاورت اور اشتراک کے ساتھ امتِ مسلمہ کی علمی و فکری راہنمائی کریں۔ اقبالؒ کے تصورِ اجتہاد کے سب پہلوؤں سے اتفاق نہ ہونے کے باوجود میں اسے ایک ایجنڈا تصور کرتے ہوئے اس پر علمی و تحقیقی کام کو آج کی ایک اہم ضرورت سمجھتا ہوں اور امتِ مسلمہ کی صحیح سمت راہنمائی کے لیے قدیم و جدید کے متوازن امتزاج کو وقت کا ایک ناگزیر تقاضا تصور کرتا ہوں۔

علامہ محمد اقبالؒ کے فقہی اور ملّی رجحانات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

...... ۱۸۵۷ء کے بعد ایک اور فقہی اور فکری مکتبِ فکر سامنے آیا جس نے فقہ کے ساتھ ساتھ حدیثِ نبوی کو بھی احکام و مسائل کا ماخذ بنانے سے گریز کرتے ہوئے صرف قرآن کریم کو عقائد و احکام کی بنیاد قرار دینے کا اعلان کیا۔ یہ سر سیّد احمد خان مرحوم کا مکتبِ فکر ہے جس نے حدیثِ نبوی کو نہ صرف یہ کہ احکام و قوانین کا مستقل ماخذ تسلیم نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم کی تشریح میں بھی حدیثِ نبوی کو اتھارٹی ماننے سے انکار کر دیا، اور کامن سینس کی بنیاد پر قرآن کریم کی تشریح کو بنیاد بنا کر اسلامی عقائد اور احکام و قوانین کی از سرِ نو تشریح و تعبیر کو مطمحِ نظر بنا لیا۔ یہ مکتبِ فکر بھی موجود و متحرک ہے اور ہمارے دور میں اس کی نمائندگی میں چودھری غلام احمد پرویز صاحب نے سب سے زیادہ شہرت پائی ہے۔

بعض حلقے مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کو بھی اسی مکتبِ فکر سے وابستہ قرار دیتے ہیں، لیکن میری طالب علمانہ رائے میں یہ بات درست نہیں ہے، اس لیے کہ علامہ اقبالؒ جس طرح جابجا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا حوالہ دیتے ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہیں، اس کے پیشِ نظر انہیں حدیثِ نبوی کی حجیت کا انکار کرنے والوں یا اس کی حیثیت کو کم کرنے والوں میں شمار کرنا علامہ محمد اقبالؒ کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔......

مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور برطانوی استعمار کے زیر سایہ ایک نئی امت پروان چڑھائی گئی تو ان کے ساتھ معاملات اور معاشرتی تعلقات کے تعین کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ایسی صورت میں فقہی احکام و قوانین کا ایک مستقل دائرہ موجود ہے جو ماضی کی اسلامی حکومتوں میں روبہ عمل بھی رہا ہے، لیکن معروضی حالات میں ان احکام و قوانین پر عمل دشوار تھا۔ اس لیے مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی اس تجویز کو علماء کرام نے اجتماعی طور پر قبول کر لیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں پر فقہی احکام کا اطلاق کرنے کی بجائے انہیں مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم گروہ کے طور پر قبول کر کے ان کا اس حیثیت سے معاشرتی درجہ طے کیا جائے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ بھی علماء کرام کا

ایک اجتہادی عمل تھا جس پر وہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی قائم رہے، اور قادیانیوں پر فقہی احکام کے اطلاق کا مطالبہ کرنے کے بجائے انہیں نے انہیں دستوری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فیصلے پر قناعت کرلی۔......

آج آپ کو ہزاروں مدارس بڑی بڑی بلڈنگوں میں نظر آئیں گے اور سیکڑوں مدارس ایسے ہیں جن کے سالانہ بجٹ کروڑوں روپے میں ہیں، جبکہ ان کی غالب اکثریت کسی قسم کی سرکاری امداد و تعاون سے بے نیاز ہوکر محض عوام کے رضاکارانہ تعاون کے ساتھ یہ نظام چلا رہے ہیں، لیکن ان مدارس کی ابتدائی صورت پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ دینی تعلیم سے بہرہ ور ایک عالمِ دین نے کسی مسجد میں ڈیرہ لگا لیا ہے، اس کے گرد چند طلبہ جمع ہوگئے ہیں، ان کی رہائش بھی مسجد میں ہے، اور محلہ کے مسلمانوں نے انہیں اپنے گھر سے روٹی دینا شروع کردی ہے، جبکہ مولوی صاحب تنخواہ یا مراعات کے کسی تعین کے بغیر کام کیے جا رہے ہیں۔ برصغیر کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد نے اس طریقے سے تعلیم پائی ہے اور میں نے اپنے بچپن میں مدرسہ کا یہ نظام نہ صرف دیکھا ہے بلکہ ابتدائی چند سال اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ایثار وقناعت، صبر و حوصلہ اور عزیمت کی بنیاد پر تشکیل پانے والے اس رضاکارانہ تعلیمی نظام کے وسیع جال نے "تحفظ و دفاع" کی اس جنگ میں کلیدی کردار ادا کیا اور اسی کے بارے میں مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے یہ کہا تھا کہ اس مدرسے کو اسی حالت میں رہنے دو، اس لیے کہ یہ مدرسہ اگر موجود نہ رہا تو اس کا جو نتیجہ ہوگا، وہ میں اپنی آنکھوں سے اسپین میں دیکھ آیا ہوں۔

......

عصرِ حاضر میں اجتہاد

(۳۰ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو مجلس صوت الاسلام پاکستان کے زیر اہتمام
"آن لائن تربیت خطباء کورس" کی ایک نشست سے خطاب کا کچھ حصہ)

...... یہ کہا جاتا ہے کہ تابعین اور اتباعِ تابعین میں تو مجتہدینِ مطلق تھے مگر آج نہیں ہیں، تو کیا اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے یا بند ہے؟ یہ ایک بڑی بحث ہے کہ آج مجتہدِ مطلق کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس پر علامہ اقبال مرحوم کے خطبات ہیں کہ پارلیمنٹ کو مجتہدِ مطلق کا درجہ حاصل ہے، وہ اپنے اصول خود وضع کرے اور اجتہاد بھی خود کرے۔ "خطباتِ اقبال" میں یہ ان کا موقف ہے۔ لیکن ان کی یہ تجویز علمی بحث تھی، فتویٰ نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ نے یہ کہا تھا کہ جس طرح "فتاویٰ عالمگیری" فقہ حنفی کی تجدید تھی، اب اس کو کئی سال گزر گئے ہیں تو اب ایک اور تجدید کی ضرورت ہے۔ اس لیے انہوں نے کچھ علمی نکات بطور تجویز کے رکھے تھے کہ اس پر بحث کی جائے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ اگر اپنے آپ کو فارغ کریں تو میں اور وہ مل کر دونوں اس کام کی نگرانی کریں۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو بہت بڑی بات ہوتی۔ علامہ اقبالؒ خود اجتہاد نہیں کرنا چاہتے تھے، صرف ان کی تجاویز تھیں۔ اور اجتہاد کے لیے ان کے سامنے دو نام تھے، علامہ انور شاہ کاشمیریؒ اور سید سلیمان ندویؒ، جن کو علامہ اقبالؒ نے خود پیشکش کی کہ آئیں بیٹھ کر اس پر کام کرتے ہیں۔......

یہ میں نے اصولی بات کی ہے کہ اجتہادِ مطلق کا دروازہ تو بند ہے لیکن اپنے مذہب کے اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے اجتہاد اور اختلاف کا دائرہ آج بھی قائم ہے، جو قیامت تک قائم رہے گا، اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات علامہ اقبالؒ نے تو اپنے لہجے میں کہی تھی، میں اپنے لہجے میں کہا کرتا ہوں کہ ہمیں عالمگیری کے بعد اپنا معیار تھوڑا سا آگے بڑھانے کی ضرورت پیش آئی تو ہم نے عالمگیری کی بجائے فتاویٰ شامیہ کو معیار بنا لیا کیونکہ عُرف بدل گیا تھا۔ عالمگیری کا عرف اور تھا، شامی کا عرف اور ہے، تو ہمارے ہاں فتوے میں عام طور پر پہلی ترجیح یہ ہوتی ہے کہ مفتیان دیکھتے ہیں کہ شامی کیا لکھتا ہے۔ ہمارے حنفی فقہاء کی پہلی ترجیح یہ ہوتی ہے کیونکہ وہ عرف ہمارے عرف کے

اقرب ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ امام شامیؒ امام ابو حنیفہؒ سے بڑے عالم ہیں۔ ہم عالمگیری کو چھوڑ کر شامی پر فتویٰ اس وجہ سے دیتے ہیں کہ ہمارا عرف ان کے عرف سے اقرب ہے، لیکن شامی کو رخصت ہوئے بھی تو سوا سو سال ہو گیا ہے۔ تب سے اس دور میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں؟ یقیناً تبدیلی آئی ہے اور تقاضہ کرتی ہے جو ہماری فقہی، دینی اور علمی ضرورت ہے کہ ایک اجتماعی مشاورت کے ذریعے فقہ حنفی کے مسائل پر غور کیا جائے، اور آج کے حالات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر وہی کام کیا جائے جو فتاویٰ عالمگیری کے زمانے میں پانچ سو علماء نے کیا تھا۔ یہ آج کی بھی ضرورت ہے۔ اقبالؒ چونکہ دوسری دنیا کا آدمی تھا اس نے اپنے لہجے میں یہی بات کی ہے۔ وہی بات میں اپنے لہجے میں کہہ رہا ہوں کہ حنفی فقہ کے اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے مسائل واحکام کی تجدیدِ نو کی ضرورت آج بھی ہے کیونکہ عرف بہت بدل گیا ہے، حالات بہت متغیّر ہو گئے ہیں۔......

پارلیمنٹ کا حقِ تعبیر وتشریح اور علماء کونسل کی تجویز

(۲۰۱۷ء کے دوران الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ میں ''نفاذِ شریعت'' کے عنوان پر سلسلۂ محاضرات کی ایک نشست سے اقتباس)

...... شریعت بل کے حوالے سے جو بحثیں پیدا ہوئیں ان میں ہمارے جدید دانشوروں کی طرف سے ایک بحث اب تک چل رہی ہے کہ جب آپ کہتے ہیں کہ قرآن وسنت ملک کا سپریم لاء ہوگا اور ہر چیز اس کے مقابلے میں ختم ہو جائے گی، تو یہ فیصلہ کرنا کس کا کام ہوگا کہ کون سی چیز قرآن وسنت کے مطابق ہے اور کون سی چیز ان کے مطابق نہیں ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔ جب کہ ہمارا موقف یہ تھا کہ اگر فیصلے کی آخری اتھارٹی پارلیمنٹ ہو تو وہ اپنی مرضی کی شریعت نافذ کرے گی، جدھر ووٹ زیادہ ہوں گے، وہ شریعت ہوگی اور جدھر ووٹ کم ہوں گے وہ شریعت نہیں ہوگی۔ اس سے بڑا کنفیوژن پیدا ہو گیا۔ یہ باریک نکتہ سمجھیں۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ قرآن وسنت کا حکم ماننا ہے۔ وہ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ قرآن وسنت کے مطابق قرار دینا یا نہ قرار دینا، اس میں اتھارٹی کون ہے؟ اس میں پارلیمنٹ سے ہٹ کر کوئی اتھارٹی ہو گی تو پارلیمنٹ کی خود مختاری کہاں گئی؟ اسی بحث میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ پارلیمنٹ کا حقِ اجتہاد تسلیم کیا جائے۔

یہ علامہ اقبال مرحوم کی پرانی تجویز تھی، ان کے بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبالؒ نے لا کر سامنے کر دی کہ پارلیمنٹ کا حقِ اجتہاد تسلیم کیا جائے۔ پارلیمنٹ اپنے اصول طے کرے اور اجتہاد بھی کرے۔ ہمارے لیے یہ موقف قابلِ قبول نہیں تھا۔ اگرچہ علامہ اقبالؒ نے درمیان کی راہ اختیار کی تھی، جو بات یہ کہتے ہیں وہ نہیں کہی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے خطبات جدید دور میں اسلامائزیشن کے لیے بڑی فکری اہمیت رکھتے ہیں، لیکن دونوں طرف اس کا غلط استعمال ہوا ہے۔ مخالفت میں بھی حد سے زیادہ بڑھ گئے اور حمایت میں بھی حد سے زیادہ بڑھ گئے۔ جو علامہ اقبالؒ کا موقف تھا، بطور تجویز کے کوئی حرج نہیں تھی کہ اس میں غور کیا جائے کہ پارلیمنٹ کو ہی حق دے دیا جائے۔ لیکن پارلیمنٹ کے ساتھ جید علماء کی ایک کونسل ہو جس سے رہنمائی کی وہ پابند ہو۔ جیسے اب

اسلامی نظریاتی کونسل وغیرہ ہیں۔ یہ اصل میں اقبالؒ کی تجویز ہی تھی لیکن یہ جب بحث چلی تو ہمارے جدید دانشوروں کا ذہن تھا اور ہے کہ پارلیمنٹ کو ہی اجتہاد کا حق دے دیا جائے۔

مسئلہ قادیانیت

کشمیر کمیٹی کا دامِ ہمرنگ زمین

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۴ مئی ۱۹۷۴ء)

۱۹۳۱ء میں ڈوگرہ ظلم وستم کے باعث ایک مسلمان کی شہادت کے بعد مدتوں سے سینوں میں پکنے والا لاوا پھٹ پڑا، پوری ریاست میں احتجاجی مظاہرے شروع ہوگئے، اہلِ کشمیر کی اس مظلومیت کو دیکھتے ہوئے انڈیا کی سیاسی جماعتوں نے بھی اس طرف توجہ دی۔ فرنگی کو اس دور میں یہ خدشہ تھا کہ کشمیر کی سرحد روس کے ساتھ ملتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ روس کشمیر کے راستہ سے اپنے اثرات انڈیا تک وسیع کر لے۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر فرنگی حکومت نے سوچا کہ کشمیر میں کسی ایسی جماعت کو تقویت دی جائے جو وہاں فرنگی مفادات کا تحفظ اور بیرونی سرگرمیوں سے فرنگی حکومت کو باخبر کر سکے۔ قادیانی جماعت کا خلیفۂ اول حکیم نور دین اس سے قبل جموں وکشمیر کے درباروں میں طبیب کی حیثیت سے فرنگی کے لیے مخبری کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس مقصد کے لیے فرنگی نے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین کو مہرہ بنایا۔ اس نے پنجاب کے سرکردہ مسلمانوں کو دھوکے سے ساتھ ملایا اور ''آل انڈیا کشمیر کمیٹی'' کی بنیاد شملہ میں رکھ دی جس کا صدر خود مرزا بشیر الدین اور سیکرٹری عبد الرحیم درد قادیانی تھا۔ اور صدر دفتر قادیان میں طے کیا گیا۔ اس کمیٹی کے علاوہ دوسرے سرکردہ مسلمانوں میں علامہ محمد اقبال مرحوم بھی تھے لیکن حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور دیگر زعماء کی مساعی سے علامہ اقبالؒ پر قادیانی سازش کی حقیقت آشکارا ہوگئی اور دوسرے مسلم شرکاء بھی اس چال کو سمجھ گئے تو انہوں نے مرزا بشیر الدین کی قیادت میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔

ادھر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد اور نامور کشمیری لیڈر میر واعظ مولانا محمد یوسفؒ فاضل دیوبند نے کشمیری راہنماؤں کو قادیانی سازش کے نتائج سے خبردار کیا جس کے نتیجہ میں مرزا بشیر الدین کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ کمیٹی نے علامہ محمد اقبالؒ کو صدر اور ملک برکت علی کو جنرل سیکرٹری چنا لیکن چند دنوں کے بعد خود علامہ اقبالؒ نے کمیٹی کو توڑنے کا اعلان کر دیا اور اس طرح کشمیر کو قادیانی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی یہ سازش ناکام ہوگئی۔

مسئلہ قادیانیت اور دینی حلقوں کے جذبات

(روزنامہ وفاق، لاہور۔ دسمبر ۱۹۹۶ء)

...... عقیدۂ ختمِ نبوت سے انکار کرنے والوں کے لیے عام مسلمانوں اور علماء کرام کے جذبات تو ابتدا سے یہی تھے کہ ایک اسلامی حکومت کو ان سے وہی معاملہ کرنا چاہیے جو خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسیلمہ کذاب اور دیگر منکرینِ ختمِ نبوت کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال مرحوم نے ان جذبات کو دستوری رخ دے دیا اور یہ تجویز پیش کی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر دوسری اقلیتوں کی طرح تسلیم کر لیا جائے۔ اس مسئلہ پر پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ علامہ اقبالؒ کی خط و کتابت تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے جس میں مفکرِ پاکستان نے قادیانیوں کے غیر مسلم ہونے اور انہیں مسلمانوں سے الگ حیثیت دینے کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ حتیٰ کہ قادیانیوں کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے بھی ایک دور میں برطانوی حکومت سے درخواست کی تھی کہ پارسیوں اور عیسائیوں کی طرح قادیانیوں کو بھی ایک جداگانہ مذہب کے پیروکار کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ لیکن برطانوی حکومت نے ابھی اس گروہ سے ایسے کام لینے تھے جن کے لیے اسے مسلمان کے طور پر پیش کرنا ضروری تھا اس لیے یہ درخواست قبولیت حاصل نہ کر سکی۔

البتہ پاکستان بننے کے بعد ملک کی دینی جماعتوں نے مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی اس تجویز کو اپنا مطالبہ بنا لیا کہ قادیانیوں کو دستوری طور پر مسلمانوں سے الگ اور غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس مطالبہ کے لیے ۱۹۵۳ء کی خون آشام تحریک چلی جس میں ہزاروں مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ پھر ایوب خان مرحوم کے دور میں ایک بار پھر تحریک ابھری مگر کوئی عملی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اور پھر ۱۹۷۴ء میں عوامی تحریک کے نتیجے میں ملک کی منتخب پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

اس طرح مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال مرحوم کی یہ تجویز اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کا حصہ بن گئی کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار ملتِ اسلامیہ کا حصہ نہیں ہیں اور وہ پاکستان میں دیگر

اقلیتوں کی طرح ایک غیر مسلم اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن قادیانیوں نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، جبکہ وہ عالمِ اسلام کے دینی وعلمی حلقوں کے متفقہ فیصلے کو قبول کرنے سے پہلے ہی انکار کر چکے تھے، اب پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلے اور ملک کے دستور کے ایک حصے کو بھی انہوں نے تسلیم نہیں کیا۔ جبکہ اس کے بعد اس آئینی فیصلے پر عملدرآمد کے سلسلہ میں ۱۹۸۴ء میں ایک اور عوامی تحریک کے نتیجے میں امتناعِ قادیانیت کا صدارتی آرڈیننس نافذ کر کے قادیانیوں کو اسلام کا نام اور مسلمانوں کی مخصوص مذہبی اصطلاحات کے استعمال سے روک دیا گیا تو قادیانیوں نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔......

علامہ محمد اقبالؒ اور مجلسِ احرارِ اسلام

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۷ جون ۲۰۰۱ء)

کشمیر کے بارے میں ''ٹریک ٹو پالیسی'' کے پس پردہ بعض سرگرم قادیانیوں کو متحرک دیکھ کر کم و بیش پون صدی قبل کا وہ منظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا ہے جب قادیانی گروہ نے کشمیر پر اپنا جال پھیلانے کے لیے مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ تک کو کچھ دیر کے لیے دامِ ہمرنگ زمین کا شکار بنالیا تھا۔ مگر مجلسِ احرارِ اسلام خطرہ کی بو سونگھتے ہوئے میدان میں کود پڑی اور اس نے نہ صرف علامہ اقبالؒ کو اس جال سے نکالنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، بلکہ ڈوگرہ سامراج کے مظالم میں مسلسل پستے چلے جانے والے مجبور کشمیری عوام کے ساتھ ہمدردی کی آڑ میں قادیانیوں کے کشمیر کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو بھی روک دیا تھا۔

یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے جب ریاست جموں و کشمیر کے مسلمان عوام ڈوگرہ حکمرانوں کے مظالم اور جبر و تشدد سے تنگ آکر بغاوت پر اتر آئے تھے، اور قرآن کریم کی توہین کے ایک شرمناک واقعہ نے کشمیر کے غیور مسلمانوں کو ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف سڑکوں پر لا کھڑا کیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ مرحوم اسی احتجاجی تحریک میں منظرِ عام پر آئے تھے اور پھر اپنی شعلہ نوائی اور قائدانہ صلاحیتوں کے باعث آگے بڑھتے چلے گئے تھے۔ اس موقع پر میاں سر فضل حسین مرحوم جو پنجاب کے ان سرکردہ سیاسی رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، جو تحریکِ آزادی کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزی حکومت کا سہارا بننے کو ترجیح دیتے رہے، انہوں نے شملہ میں کشمیری عوام کی حمایت کے لیے اپنے سیاسی ذوق کے حامل حضرات پر ایک کشمیر کمیٹی تشکیل دی، جس کا سربراہ قادیانی گروہ کے قائد مرزا بشیر الدین محمود کو بنایا گیا اور چند دیگر سرکردہ مسلمان قائدین کے ساتھ ساتھ علامہ محمد اقبالؒ کو بھی کشمیر کمیٹی کا رکن بنالیا گیا۔

مرزا بشیر الدین محمود کی سربراہی میں بننے والی کشمیر کمیٹی سے اس کے علاوہ کیا توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ مسلمانوں کی مظلومیت اور جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاست جموں و کشمیر میں قادیانی اثر و نفوذ کو فروغ دے گی۔ اور اس کمیٹی میں علامہ اقبالؒ کو شامل کرنے کا مقصد مسلمانوں میں اس عظیم

فلسفی شاعر اور مفکر کی مقبولیت کی آڑ میں اپنے لیے پیشرفت کی جگہ بنانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ اس پس منظر میں مرزا بشیر الدین محمود اور ان کے بعض حواریوں کی طرف سے کشمیر کو قادیانی ریاست بنانے کی خواہش کا بھی اظہار ہونے لگا جسے برصغیر کے دیندار مسلمانوں اور خاص طور پر مجلسِ احرارِ اسلام نے محسوس کیا۔ احرار رہنماؤں کے وفد نے علامہ اقبالؒ سے ملاقات کر کے انہیں اس خطرہ سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے درخواست کی وہ مرزا بشیر الدین محمود کی سربراہی میں بننے والی کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کریں۔ علامہ اقبالؒ نے یہ درخواست منظور کر لی اور کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد اگست ۱۹۳۱ء کے وسط میں مجلسِ احرارِ اسلام نے کشمیری عوام کی حمایت میں خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اکتوبر میں چوہدری افضل حق مرحوم، مولانا مظہر علی اظہر مرحوم اور خواجہ غلام محمد مرحوم پر مشتمل احرار قائدین کا وفد کشمیری عوام کے مطالبات پر ڈوگرہ حکمرانوں سے بات چیت کے لیے جموں پہنچا، مگر بات چیت جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچی تو مجلسِ احرارِ اسلام نے کشمیری عوام کی حمایت میں احرار کارکنوں کو کشمیر بھیجنے اور ان کی تحریک میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسی دوران امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو دہلی سے گرفتار کر لیا گیا اور ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی جس سے احرار کارکنوں کے جذبات میں مزید جوش و خروش پیدا ہوا۔

نومبر ۱۹۳۱ء میں احرار کارکنوں نے چاروں طرف سے کشمیر پر یلغار کر دی، جہلم سے میر پور، راولپنڈی سے کوہالہ، اور سیالکوٹ سے سچیت گڑھ کے راستے احرار رضاکار کشمیر میں داخل ہونا شروع ہوئے جنہیں ریاست کی حدود میں قدم رکھتے ہی گرفتار کر لیا جاتا۔ تین ماہ کے عرصہ میں چالیس ہزار کے لگ بھگ رضاکاروں کو کنٹرول سے باہر ہوتا دیکھ کر ڈوگرہ حکمرانوں نے دہلی کی انگریز حکومت سے رابطہ کیا، جس نے پہلے جمعیت علماء ہند کے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے ذریعہ احرار رہنماؤں سے مفاہمت کا راستہ نکالنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوئی، جس پر احرار کے خلاف دار و گیر اور جبر و تشدد کا محاذ دہلی کی انگریز حکومت نے براہ راست سنبھال لیا۔ پھر تحریک کا دائرہ ریاست سے نکل کر پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ کشمیر کے بعض لیڈروں کو ریاست میں احرار کی مقبولیت بڑھنے سے اپنی قیادت ڈگمگاتی دکھائی دی اور بعض معاصر سیاسی جماعتوں نے بھی تعاون کی امیدیں

پوری نہ کیں جس کی وجہ سے مجلس احرار اسلام کی یہ جدوجہد مزید آگے نہ بڑھ سکی۔ البتہ کشمیری عوام میں سیاسی بیداری اور جذبۂ حریت کو فروغ دینے میں اس تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ ورنہ اگر برصغیر کی دوسری سیاسی جماعتیں بھی اس موقع پر احرار کا ساتھ دیتیں اور ریاست جموں وکشمیر کی مقامی لیڈر شپ احرار کو اپنا حریف قرار دینے کی بجائے دوست اور معاون سمجھ لیتی تو آج اس خطہ کی صورتحال ہی مختلف ہوتی۔......

علامہ محمد اقبالؒ اور کشمیر کے بتیس لاکھ مسلمان

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۰ اگست ۲۰۰۱ء)

...... حادثہ یہ تھا کہ جموں میں ریاستی پولیس کا ایک مسلمان سپاہی اپنی بیرک میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا کہ بغیر کسی نزاع کے ایک ہندو سنیاسی نے سپاہی کے ہاتھ سے قرآن کریم چھین کر زمین پر دے مارا۔ کتاب اللہ کی توہین نے تمام نظم ونسق کو پریشان کر دیا۔ عوام، کسان اور خصوصاً مسلمان حکومتِ کشمیر کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کشمیری عوام میں لیڈر کی حیثیت سے روشناس کرائے گئے۔ ان کی تقریروں نے کشمیری عوام کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا کر مہاراجہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس تصادم میں حکومت کی طرف سے نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلیں اور خون بے گناہ سے سرخ دریائے جہلم کی بپھری ہوئی موجیں کناروں سے ٹکرانے لگیں۔

ایسے حالات نے پنجاب کے مسلمانوں کو بھی چونکا دیا اور پریس نے حالات کو بیدار کرنے میں خوب معاونت کی۔ انہی دنوں سر فضل حسین نے شملہ میں چند رجعت پسند مسلمانوں کے تعاون سے ''کشمیر کمیٹی'' کی بنیاد رکھی، جس کا صدر قادیان کے مرزا بشیر الدین محمود اور سیکرٹری عبد الرحمن (قادیانی) کو نامزد کیا گیا۔ میاں فضل حسین اس کمیٹی کے نگران مقرر ہوئے۔ کشمیر کمیٹی کی تشکیل کے ساتھ ہی مرزائی خلیفہ نے سرکار پرست مسلمان راہنماؤں کو اس کمیٹی کا رکن نامزد کیا، اور ان کے علاوہ علامہ سر محمد اقبالؒ کو بھی اس کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔ احرار راہنماؤں کو جب اس ڈرامے کا علم ہوا تو وہ علامہ اقبالؒ سے ملے، انہیں حالات سے آگاہ کیا کہ آپ کی وجہ سے نہ صرف کشمیر کا بتیس لاکھ مسلمان مرزائی ہو جائے گا، بلکہ بیرونی ممالک کے مسلمان بھی اس فریب سے متاثر ہوں گے، لہٰذا آپ کو کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دینا چاہیے (جو انہوں نے کر دیا)۔ چنانچہ دوسرے ہی روز برکت علی محمڈن ہال میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس ہوا، اس میں تحریکِ کشمیر کی ساری ذمہ داری مجلسِ احرار کے سپرد کر دی گئی۔......

نوابزادہ نصر اللہ خان اور قادیانیت

(۲۸ مئی ۲۰۰۲ء کو فلیٹیز ہوٹل لاہور میں جمعیت علماء اسلام پاکستان کی
''آل پارٹیز ختمِ نبوت کانفرنس'' سے خطاب)

...... نوابزادہ نصر اللہ خان نے قادیانیت کا سیاسی پس منظر بیان کیا اور کہا کہ یہ فتنہ انگریزوں نے جہاد کے حوالہ سے مسلمانوں کے عقیدہ اور جذبہ کو کمزور کرنے کے لیے جنم دیا تھا۔ انہوں نے قادیانیوں کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ کے بہت سے اشعار اور ارشادات کا حوالہ دیا کہ وہ قادیانیت اور اس کی دعوت و تعلیم کو مسلمانوں کے لیے غلامی کا پیغام سمجھتے تھے۔

نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہا کہ صرف ختمِ نبوت کے حلف کا مسئلہ نہیں بلکہ ملک کا پورا دستور سازشوں کی زد میں ہے اور اسے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس موقع پر انتباہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ ۱۹۷۳ء کا دستور ختم کر دیا گیا تو اس ملک میں نیا دستور نہیں بن سکے گا اور جو دستور بنے گا وہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کا دستور نہیں ہوگا۔......

''پاکستان کے مذہبی اچھوت''

(روزنامہ پاکستان، لاہور- ۲۱ جولائی ۲۰۰۳ء)

بعض مذہبی رہنماؤں کی طرف سے ''پاکستان کے مذہبی اچھوت'' نامی ایک کتاب کے مندرجات پر سخت غم وغصہ کا اظہار کیا جارہاہے، جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ

- یہ دو قادیانی مصنفین تنویر احمد میر اور مرتضیٰ علی شاہ کی مشترکہ کاوش ہے۔ اور اس میں پاکستان میں قادیانیوں پر ہونے والے مبینہ مظالم کا رونا روتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصلی اور کھرے مسلمان صرف قادیانی ہیں جنہیں پاکستان میں اچھوت بنادیا گیا ہے، حالانکہ قادیانیوں کی کوششوں کے نتیجے میں ہی پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور پنجاب بھی انہی کی کوششوں کی وجہ سے پاکستان میں شامل ہوا۔
- اس کتاب کے جو مندرجات بعض اخبارات کے ذریعے سامنے آئے ہیں، ان میں کہا گیا ہے کہ جداگانہ الیکشن کا نظریہ مرزا غلام احمد قادیانی نے پیش کیا تھا اور مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے بھی مرزا قادیانی کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ اس کتاب کے مصنفین کا کہنا ہے کہ ''احمدیت'' ہی حقیقی اسلام ہے اور بالآخر اسی کے ذریعے تمام مذاہبِ عالم ایک جھنڈے تلے جمع ہوں گے اور ساری دنیا حلقہ بگوشِ اسلام ہوجائے گی۔
- کتاب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار نہ دیا جاتا تو ضلع گورداسپور بھی پاکستان میں شامل ہوجاتا، اور بھارت کو کشمیر میں داخلے کا راستہ نہ ملتا، جس کے نتیجے میں آج تک کشمیر کا تنازع موجود ہے۔
- کتاب کا عنوان اور بنیادی خیال یہ ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کو مذہبی اچھوت بنادیا گیا ہے، ان کی مذہبی آزادی سلب کرلی گئی ہے، ان پر مسلسل مظالم ڈھائے جارہے ہیں، اور ان کا سوشل بائیکاٹ کیا گیا ہے۔

مذہبی آزادی سلب ہونے اور ان پر مظالم ڈھائے جانے کی بات تو ہم کسی اور موقع پر کریں گے،

مگر اس بنیادی نکتہ سے ہمیں اتفاق ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کو فی الواقع ''اچھوت'' کا درجہ حاصل ہے اور انہیں مسلم معاشرے میں وہ سماجی مقام میسر نہیں جو مسلم سوسائٹی کے مختلف طبقات کے لیے مخصوص ہے۔ عام مسلمانوں میں قادیانیوں کا تذکرہ حقارت سے ہوتا ہے اور ان کے ساتھ میل جول کو عام طور پر پسند نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس کا سبب مسلمان نہیں بلکہ خود قادیانی ہیں، انہوں نے شروع سے طرز عمل ہی ایسا اختیار کر رکھا ہے کہ ان کے لیے کسی مسلم معاشرے میں وہ جگہ نہیں بن سکی جس کے وہ خواہشمند ہیں۔ اگر تاریخی حقائق کا جائزہ لیا جائے تو ایک مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے اپنے لیے اچھوت کا کردار خود قادیانیوں نے منتخب کیا ہے جس کی ذمہ داری خود ان کے سوا کسی اور پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً مسلمانوں کے چودہ سو سال سے اجتماعی طور پر چلے آنے والے متفقہ عقیدۂ ختمِ نبوت سے انحراف پہلا قدم ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی نے ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی دھارے کے علی الرغم اٹھایا اور خود کو امتِ مسلمہ سے الگ کر لیا۔

پوری امتِ مسلمہ چودہ سو برس سے اس بات پر متفق چلی آ رہی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے بعد کسی شخص کو قیامت تک نبوت نہیں ملے گی، اور جو شخص بھی رسول اکرمؐ کے بعد نبوت اور وحی کا دعوی کرتا ہے وہ جھوٹا ہے اور اسے کسی صورت میں نبی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں نے اس اجتماعی عقیدے سے انحراف کا راستہ اختیار کیا اور اس کے باوجود اس بات پر مصر رہے کہ وہ نہ صرف ملتِ اسلامیہ کا حصہ ہیں بلکہ اصلی مسلمان وہی ہیں، اور دنیا بھر کے وہ تمام مسلمان جو مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں کو نہیں مانتے وہ مسلمان نہیں رہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ قادیانیوں کے اس دعویٰ بلکہ ہٹ دھرمی کو کسی طرح بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا، اور مسلمانوں کا یہ فطری اور منطقی حق تھا کہ وہ اس بات کا صاف اعلان کر دیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکار مسلمانوں کے اجتماعی دھارے کا حصہ نہیں ہیں اور ان سے الگ وجود رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جو علماء کرام اور دینی رہنماؤں نے تو کہنا ہی تھی، جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اسے تسلیم کیا، اور سب سے زیادہ مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کی کہ قادیانی نئی نبوت اور نئی وحی کی وجہ سے مسلمانوں سے الگ ہو چکے ہیں اور ان کا ملتِ

اسلامیہ کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ حتیٰ کہ جب پنڈت جواہر لال نہرو قادیانیوں کی وکالت کے لیے سامنے آئے تو ان کے ساتھ علامہ اقبالؒ نے خط وکتابت کی اور ان کے نام اپنے مکاتیب میں واضح کیا کہ قادیانی گروہ کسی طرح بھی ملتِ اسلامیہ کے وجود کا حصہ نہیں ہے۔

پھر قادیانیوں نے بھی ہر مرحلہ میں خود کو مسلمانوں سے الگ شمار کیا ہے:

- جسٹس منیر انکوائری کمیشن کی رپورٹ کے مطابق سب سے پہلے قادیانیوں کو مردم شماری میں ۱۹۰۱ء میں الگ کیا گیا اور اس کی تحریک مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف سے ہوئی تھی۔
- جبکہ ضلع گورداسپور کے بھارت میں شامل ہونے کے حوالے سے جس بات کا ذکر کیا گیا وہ بھی مغالطہ دینے کی کوشش ہے۔ کیونکہ ریڈ کلف سرحدی کمیشن کے ریکارڈ کے مطابق اصل صورتحال یہ ہے کہ ضلع گورداسپور جس میں قادیان واقع ہے، اور جس کی آبادی کے تناسب میں قادیانیوں کو یہ پوزیشن حاصل تھی کہ اگر انہیں مسلمانوں کے ساتھ شمار کیا جاتا تو یہ ضلع پاکستان میں شامل ہو جاتا۔ اس صورت میں اس وقت بھارت کے پاس کشمیر میں داخل ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا، اور کشمیر کسی رکاوٹ کے بغیر خود بخود پاکستان کا حصہ بن رہا تھا۔ لیکن سرحدات کے تعین کرنے والے ریڈ کلف کمیشن کے سامنے قادیانیوں کے نمائندے چودھری ظفر اللہ خان نے یہ کہہ کر قادیانیوں کا الگ کیس پیش کیا کہ ان کی جماعت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت ہے کہ ان کی فائل مسلمانوں سے الگ طور پر کمیشن کے سامنے پیش کی جائے۔ چنانچہ اس بنیاد پر گورداسپور غیر مسلم اکثریت کا ضلع قرار پا کر بھارت میں شامل ہو گیا، اور پھر اسی راستے سے گزر کر بھارتی فوجوں نے کشمیر پر قبضہ کیا، اور آج مسئلہ کشمیر پورے جنوبی ایشیا کے امن اور ترقی کے لیے خوفناک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ مسلمان اس وقت بھی قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے تھے، لیکن ریڈ کلف کمیشن کے سامنے الگ حیثیت کی بات اس وقت مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ قادیانیوں کی طرف سے سامنے آئی تھی، اس لیے اس علیحدگی اور جداگانہ راستہ کے جو بھی منطقی نتائج سامنے آئے ان کی ذمہ داری بھی خود ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔

جہاں تک سوشل بائیکاٹ کی بات ہے اس کی ابتدا بھی قادیانیوں نے کی تھی، مثلاً:

- قادیانی اخبار ''الحکم'' قادیان اگست ۱۹۰۱ء کے مطابق مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی جماعت کے ارکان کو پابند کیا کہ وہ مسلمانوں کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔
- اخبار ''الفضل'' قادیان ۳ مئی ۱۹۲۲ء کے مطابق قادیانی خلیفہ حکیم نور الدین نے اپنی جماعت کو ہدایت جاری کی کہ وہ کسی غیر احمدی کا جنازہ نہ پڑھیں۔
- اخبار ''الحکم'' ۱۶ اپریل ۱۹۰۸ء کے مطابق مرزا بشیر الدین محمود نے اعلان کیا کہ غیر احمدیوں کے ساتھ رشتہ کرنا جائز نہیں ہے۔
- اور ''کلمۃ الفصل'' میں مرزا بشیر احمد (ایم ایم احمد کے والد) نے کہا کہ غیر احمدیوں کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات حرام ہیں۔

اس لیے اگر قادیانی یہ محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان کے مسلم معاشرے میں ان کے ساتھ سوشل بائیکاٹ کا معاملہ کیا جا رہا ہے تو اس کی پہل بھی خود ان کے بڑوں نے کی ہے، اور سماجی مقاطعہ کی مختلف صورتیں بھی خود انہوں نے ہی پیدا کی ہیں۔ جس کے بعد اگر مسلمانوں نے بھی ردعمل میں انہیں سماجی مقاطعہ اور سوشل بائیکاٹ کے ماحول سے دوچار کر دیا ہے تو اس میں صرف مسلمانوں کو ذمہ دار قرار دینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔

اس سارے قصے کا ڈراپ سین اس وقت ہوا جب ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی منتخب قومی اسمبلی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تجویز پر غور کر رہی تھی، اور قادیانی جماعت کے اس وقت کے سربراہ مرزا ناصر احمد آنجہانی کو قومی اسمبلی کے فلور پر مسلسل گیارہ روز تک اپنے موقف کی وضاحت کا موقع دیا گیا تھا۔ انہوں نے اٹارنی جنرل مسٹر یحییٰ بختیار مرحوم کے سوال پر دوٹوک انداز میں کہہ دیا تھا کہ دنیا بھر کے جو مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی کو ان کے دعووں میں سچا نہیں مانتے وہ قادیانیوں کے نزدیک مسلمان نہیں ہیں، خواہ انہوں نے مرزا قادیانی کا نام بھی نہ سن رکھا ہو۔ اس کے بعد اگر قومی اسمبلی نے دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کو کافر تسلیم کرنے کی بجائے چند لاکھ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ کیا تو اس پر سیخ پا ہونے کی بھلا کون سی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔

آج بھی قادیانیوں کی مشکلات کا سب سے بڑا سبب وہ خود ہیں۔ وہ مسلمانوں کے اجتماعی عقیدے سے انحراف بھی کر رہے ہیں اور ان کی صفوں میں گھسے رہنے پر بھی مُصر ہیں۔ یہ غیر منطقی اور قطعی طور

پر ناقابلِ قبول بات ہے جو دنیا کی کوئی بھی قوم قبول نہیں کر سکتی۔ قادیانیوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے اور ہٹ دھرمی اور ضد کا وہ طرزِ عمل ترک کرنا چاہیے جس کے نتیجے میں وہ ''پاکستان کے مذہبی اچھوت'' کا درجہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جس کی ایک ہی صورت ہے کہ

۱. یا تو مرزا قادیانی کی نبوت اور وحی پر چار حرف بھیجتے ہوئے چودہ سو سالہ اجتماعی عقیدے کی بنیاد پر ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی دھارے میں واپس آجائیں،

۲. اور یا اپنے بارے میں دنیا بھر کی ملتِ اسلامیہ کا متفقہ فیصلہ قبول کر کے مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہبی گروہ کے تشخص کو قبول کر لیں۔

اس کے سوا تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے، اور جو تیسرا راستہ قادیانی دھونس اور ہٹ دھرمی کے ساتھ نکالنا چاہتے ہیں وہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے جس کا انہیں اپنے سوا کسی اور کو دوش نہیں دینا چاہیے۔

مسلمانوں اور قادیانیوں کی طرف سے تکفیر کے اعلانات

(روزنامہ اسلام، ملتان -۲۵ فروری ۲۰۰۴ء)

......مسلمانوں کے بنیادی اور اجتماعی عقائد سے اس انحراف کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کے علماء کرام نے مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے پیرو کاروں کو کافر اور مرتد قرار دیا۔ اور مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے جانشینوں نے بھی مرزا قادیانی کے ان دعووں اور عقائد پر ایمان نہ لانے والوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا۔ چنانچہ مرزا بشیر الدین محمود نے اعلان کیا کہ

> ''کل مسلمان جو مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے، خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا، وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔'' (آئینہ صداقت، ص ۳۵)

اس سے یہ بات دونوں کے نزدیک طے ہوگئی کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں کو تسلیم نہ کرنے والے دنیا بھر کے مسلمان الگ مذہب کے پیرو کار ہیں، اور مرزا قادیانی کو ماننے والے ان سے الگ مذہب رکھتے ہیں۔ چنانچہ مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات تجویز کی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ سمجھا جائے اور ایک نئے مذہب کا پیرو کار قرار دیا جائے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے یہ بھی کہا کہ قادیانی مذہب یہودیت کا چربہ ہے اور اس کے عقائد کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پر پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کی خط و کتابت بھی ہوئی اور علامہ اقبالؒ نے پنڈت نہرو کے نام اپنے خطوط میں اپنے موقف کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ اس موقع پر جب پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ علامہ اقبالؒ کی خط و کتابت ہو چکی تھی، قادیانیوں نے لاہور میں پنڈت نہرو کو استقبالیہ دیا اور اس کی وجہ اس وقت کے قادیانی خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے خطبہ جمعہ میں یہ بیان کی کہ

> ''اگر پنڈت جواہر لال نہرو اعلان کر دیتے کہ احمدیت کو مٹانے کے لیے وہ اپنی تمام طاقت خرچ کر دیں گے جیسا کہ احرار نے کیا ہوا ہے، تو اس قسم کا استقبال بے غیرتی

ہوتا، لیکن اگر اس کے برخلاف یہ مثال موجود ہو کہ قریب کے زمانہ میں ہی پنڈت صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے ان مضامین کا رد لکھا ہے جو انہوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیے جانے کے لیے لکھے تھے، اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراض اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور خود ان کے گزشتہ رویہ کے خلاف ہے، تو ایسے شخص کا جبکہ وہ صوبے میں مہمان کی حیثیت سے آرہا ہو، ایک سیاسی انجمن کی طرف سے استقبال بہت اچھی بات ہے۔"

(اخبار الفضل، قادیان۔ ۱۱ جون ۱۹۳۶ء)

......

قادیانیت: جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور علامہ محمد اقبالؒ

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۵ مئی ۲۰۰۶ء)

...... جدید تعلیم یافتہ حضرات کو قادیانیت کے اصل چہرے سے روشناس کرانے میں مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال مرحوم کا کردار سب سے نمایاں ہے، انہوں نے سب سے پہلے قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ غیر مسلم گروہ قرار دینے کی تجویز پیش کی۔ تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں قادیانیوں کی آئینی حیثیت کے بارے میں بالآخر اس تجویز پر متفق ہوگئے اور اسی کو مطالبہ قرار دے کر تحفظِ ختمِ نبوت کی تحریک چلائی جو ۱۹۷۴ء میں دستوری طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر منتج ہوئی۔

علامہ محمد اقبالؒ کے ساتھ اس مسئلہ پر پنڈت جواہر لال نہرو کی خط وکتابت ہوئی جس میں پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی وکالت کی، اور علامہ اقبالؒ نے قادیانیوں کے غیر مسلم ہونے کو دلائل کے ساتھ واضح کیا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے علامہ اقبالؒ اور پنڈت جواہر لال نہرو کی اس تاریخی خط وکتابت کا مطالعہ ضروری ہے، اس سے قادیانیوں کی مذہبی حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی اور سماجی پوزیشن بھی پوری طرح بے نقاب ہوجاتی ہے۔......

قادیانیت کے بارے میں اقبالؒ کے ارشادات

(روزنامہ پاکستان، لاہور-۲۶ مئی ۲۰۰۸ء)

۲۶ مئی قادیانی مذہب کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کا یومِ وفات ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں وفات پائی تھی جسے ایک صدی مکمل ہو گئی ہے۔ اور اپنے مذہب کے ایک سو سال مکمل ہو جانے پر مرزا قادیانی کے پیروکار دنیا بھر میں یہ پورا سال "صد سالہ تقریبات" کے عنوان سے منا رہے ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ پاکستان میں انہیں یہ تقریبات منانے کی اجازت نہیں دی جا رہی جو انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ مگر سرکاری حلقوں کا کہنا ہے کہ چونکہ وہ اپنی سرگرمیاں اپنے مذہب کے الگ نام کی بجائے اسلام کے نام پر جاری رکھنا چاہتے ہیں، اور ملک کے دستور میں انہیں غیر مسلم اقلیت کا درجہ دیے جانے کے باعث اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے انہیں اسلام کے نام پر اور مسلمانوں کی مخصوص اصطلاحات کے ساتھ اپنے جداگانہ مذہب کی تبلیغ و تشہیر کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

البتہ دنیا کے بہت سے علاقوں میں قادیانیوں کی یہ صد سالہ تقریبات ہو رہی ہیں۔ حتیٰ کہ انڈونیشیا میں اسی قسم کی سرگرمیوں اور تقریبات کے ردعمل کے طور پر وہاں کی دینی جماعتیں قادیانیوں کو انڈونیشیا میں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئیں، جس کے لیے گزشتہ دنوں جکارتہ میں صدارتی محل کے باہر ایک زبردست عوامی مظاہرہ بھی کیا گیا۔

بہر حال اس فضا میں جہاں مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار اپنے مذہب کا صد سالہ جشن منا رہے ہیں اور مختلف تقریبات میں اپنی سو سالہ پیشرفت اور کامیابیوں کا تذکرہ کرنے میں مصروف ہیں، وہاں تحفظِ عقیدۂ ختمِ نبوت کے عنوان سے قادیانیوں کے خلاف سرگرمِ عمل جماعتیں بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "تصویر کے دوسرے رخ" کے طور پر اجتماعات کا اہتمام کر رہی ہیں۔

ان میں سے ایک اجتماع ۲۶ مئی پیر کو صبح دس بجے ایوانِ اقبال لاہور میں انٹرنیشنل ختم نبوت مووومنٹ پاکستان کے زیر اہتمام ہو رہا ہے، جس کے سربراہ مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کے فرزند اور پنجاب

اسمبلی کے رکن مولانا محمد الیاس چنیوٹی ہیں۔ اور ہماری معلومات کے مطابق اس کانفرنس سے مختلف مذہبی مکاتبِ فکر کے سرکردہ رہنماؤں کے علاوہ سابق صدر پاکستان جناب رفیق تارڑ اور ممتاز مسلم لیگی رہنما راجہ محمد ظفرالحق بھی خطاب کرنے والے ہیں۔

یہ کانفرنس چونکہ ایوانِ اقبال میں ہو رہی ہے اور علامہ اقبالؒ کا بھی اس مسئلہ کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے، اس لیے ہم آج کے کالم میں قادیانیت کے حوالے سے علامہ اقبالؒ کے ارشادات کا ایک انتخاب پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس تمہیدی گزارش کے ساتھ کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم اقلیت کا درجہ دینے کی تجویز سب سے پہلے مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ نے پیش کی تھی۔ اور انہی کی اس تجویز کو پاکستان بن جانے کے بعد ملک کے تمام دینی حلقوں نے اپنا مشترکہ مطالبہ قرار دیا تھا، جس پر ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم (قائدِ ایوان) اور مولانا مفتی محمودؒ (قائدِ حزب اختلاف) کی قیادت میں قادیانیوں کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت کا درجہ دینے کا دستوری فیصلہ صادر کیا تھا۔

پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کے اس فیصلے، ملک کے تمام دینی حلقوں کے متفقہ مطالبہ، اور مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ کی اس تجویز کا پس منظر کیا ہے؟ اسے علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

سید نذیر نیازی مرحوم کے نام ایک خط میں اقبالؒ فرماتے ہیں:

> ”ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزائے نبوت موجود ہیں، یعنی یہ کہ مجھے الہام ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے، تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل ہے، مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا تھا۔“

سید نذیر نیازی مرحوم ”اقبالؒ کے حضور“ میں لکھتے ہیں کہ

> ”چودھری صاحب جب کبھی موقع پاتے، قادیانی سیاست پر کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیتے۔ حضرت علامہ کی طبیعت پر بھی بیان کر رد و کد سے جو بار پڑا تھا، وہ دور ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ چودھری صاحب کہنے لگے: ”مزے کی بات یہ ہے کہ اہلِ قادیان اگرچہ عقیدتاً ہمیں کافر سمجھتے ہیں مگر اس کے باوجود اتحاد کے بھی خواہشمند ہیں۔ وہ کہتے

ہیں کہ ہم سب کو ایک ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ہندو بہر حال ہم سب کو ایک سمجھتے ہیں"۔ حضرت علامہؒ نے فرمایا: "یہ خوب منطق ہے، اسلام کی بنا پر تو ہم ایک ہیں نہ ایک ہو سکتے ہیں، اور ہو سکتے ہیں تو ہندوؤں کے اس کہنے پر کہ ہم سب مسلمان ہیں"۔ ارشاد ہوا کہ "دراصل ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو قادیانیوں کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیں، البتہ وہ ہمیں برابر کافر سمجھتے رہیں، یہ کیا خوب بنائے اتحاد ہے"۔ اس پر ہم سب کو ہنسی آگئی۔"

قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے تنقیدی افکار پر اخبار "سٹیٹس مین" نے مضمون لکھا، جس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے تفصیلی مضمون تحریر فرمایا۔ اس میں اقبالؒ لکھتے ہیں کہ

"ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانیٔ تحریک نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے، اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام، مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ، اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔۔۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبے کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے اپنے متعدّد مضامین کے علاوہ اشعار میں بھی عقیدۂ ختم نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت کو موضوع بحث بنایا ہے۔ چنانچہ مثنوی رموز خودی میں فرماتے ہیں:

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را

او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمت ساقی گری با ما گذاشت
داد ما را آخرین جامے کہ داشت
''لا نبی بعدی'' ز احسان خدا است
پردۂ ناموس دین مصطفیٰؐ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظ سر وحدت ملت ازو
حق تعالی نقش ہر دعوی شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست
دل ز غیر اللہ مسلماں بر کند
نعرۂ لا قوم بعدی می زند

''اللہ تعالی نے ہم پر شریعت اور ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کر دی ہے۔ ہمارے رسولؐ پر انبیاء کا سلسلہ اور ہم پر اقوام کا سلسلہ ختم کر دیا ہے، اب بزمِ جہاں کی رونق ہم سے ہے۔ میخانۂ شریعت کا آخری جام ہمیں عطا فرمایا گیا ہے، اب قیامت تک ساقی گری کی خدمت ہم ہی سرانجام دیں گے۔ نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی کہ ''میرے بعد کوئی نبی نہیں'' احسانات خداوندی میں سے ایک احسان ہے اور دینِ مصطفیٰؐ کا محافظ بھی یہی ہے۔ مسلمانوں کا اصل سرمایۂ قوت یہی عقیدہ ہے اور اسی میں وحدتِ ملت کا راز پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالی نے حضورؐ کے بعد ہر دعوائے نبوت کو باطل ٹھہرا کر اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے مجتمع کر دیا ہے۔ اسی عقیدہ کے باعث مسلمان ایک اللہ کے سوا سب سے تعلق توڑ لیتا ہے، اور ''امتِ مسلمہ کے بعد کوئی امت نہیں'' کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ ہمارے زمانے نے ایک نبی پیدا کیا ہے جسے قرآن میں اپنے سوا کوئی نظر نہیں آیا۔ خود پسند، جاہ پرست اور کوتاہ نظر ہے اور اس کا دل لاالٰہ سے خالی ہے۔ مسلمانوں کے گھر پیدا ہو کر کلیسا کا مرید ہوا، اور اس نے ہماری عزت کا پردہ چاک کر دیا۔ اس کا دامن

تھا منا بے وقوفی ہے اور اس کا سینہ روشن دل سے خالی ہے۔ اس کی پر جوش گفتگو اور چرب زبانی سے بچنے کی کوشش کرو۔ اس کا پیر شیطان اور فرنگی کا غلام ہے، اگرچہ کہتا ہے کہ میں بایزیدؒ کے مقام سے بول رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ غلامی میں ہی دین کی رونق ہے، اور خود اس کی زندگی خودی سے محروم ہے۔ غیروں کی حکمرانی کو اس نے رحمت قرار دیا، اور کلیسا کے گرد رقص کرتے کرتے مر گیا۔"

اس لیے ۲۶ مئی کو علامہ اقبالؒ کی تعلیمات کے مرکز ایوانِ اقبال میں منعقد ہونے والی یہ ختمِ نبوت کانفرنس جہاں عقیدۂ ختمِ نبوت کے ساتھ مسلمانوں کے والہانہ تعلق کا ایک بار پھر اظہار ہے، وہاں صاحبِ ایوان یعنی مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے لیے خراجِ عقیدت کی حیثیت بھی رکھتا ہے، جس سے علامہ اقبالؒ کی روح یقیناً خوش ہو گی۔

قادیانیت کے سو سال

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ ۲۶ مئی ۲۰۰۸ء)

قادیانی مذہب کے پیروکاروں کے لیے ۲۶ مئی کا دن بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس روز قادیانی مذہب کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی نے لاہور میں وفات پائی تھی۔ جبکہ ۲۰۰۸ء کا یہ سال اس سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ مرزا صاحب کی وفات کو پوری ایک صدی مکمل ہو رہی ہے کیونکہ ان کی وفات اب سے ایک سو برس قبل ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو ہوئی تھی۔ قادیانی مذہب کے پیروکار اس مناسبت سے دنیا کے مختلف حصوں میں صد سالہ تقریبات کا اہتمام کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ ۲۰۰۸ء کے پورے سال کو محیط ہے۔

پاکستان میں یہ سرگرمیاں اس لیے نظر نہیں آ رہیں کہ حکومت انہیں ان سرگرمیوں کی اجازت نہیں دے رہی جو قادیانیوں کے بقول ان کے انسانی حقوق اور مذہبی آزادیوں کی خلاف ورزی ہے۔ جبکہ حکومتی حلقوں کا کہنا ہے کہ پاکستان کے دستور میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے مگر وہ اس دستوری فیصلے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنی مذہبی سرگرمیاں اسلام کے نام پر جاری رکھنا چاہتے ہیں جس پر مسلمانوں کو سخت اعتراض ہے اور ایسی سرگرمیوں سے امنِ عامہ میں خلل واقع ہو سکتا ہے، اس لیے قادیانیوں کو پاکستان کی حدود میں اسلام کے نام پر اور مسلمانوں کی مخصوص مذہبی علامات و شعائر کے ساتھ مذہبی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

مگر اس تنازعہ و کشمکش سے قطع نظر ہم ایک اور پہلو سے قادیانی مذہب کی ایک سو سالہ تاریخ کا مختصر جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ قادیانی مذہب کے اراکین اور قائدین اپنی صد سالہ تقریبات میں اپنے مذہب کی سو سال کی پیشرفت اور کامیابیوں کا تذکرہ کر رہے ہیں اور اسے اپنی حقانیت اور سچائی کی دلیل کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے ایک فاضل دوست مولانا مشتاق احمد چنیوٹی نے اس موقع پر ایک کتابچہ مرتب کیا ہے اور اس میں ایسی ناکامیوں کا باحوالہ ذکر کر کے ان کی تعداد کو سو سے زیادہ تک پہنچا دیا ہے۔ یہ کتابچہ ۲۶ مئی کو صبح دس بجے ایوان اقبالؒ لاہور میں انٹرنیشنل ختم نبوت

موومنٹ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی ختمِ نبوت کانفرنس میں تقسیم کیا جائے گا جس میں مختلف دینی وسیاسی جماعتوں کے سرکردہ قائدین خطاب کرنے والے ہیں۔ اس کتابچہ میں انہوں نے مرزا صاحب کے مناظر اور مباہلوں کا تذکرہ کیا ہے جو سرکردہ علماء کرام کے مقابلہ میں تھے اور جن میں مرزا غلام احمد قادیانی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کتابچہ میں مرزا صاحب کی الہامی پیشگوئیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو بڑے طمطراق سے کی گئیں لیکن پوری نہ ہو سکیں اور بہت سے دعووں کا ذکر ہے جن پر مرزا صاحب پورے نہ اتر سکے۔ ہم یہاں ان دعووں میں سے بطور نمونہ صرف ایک کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور پہلو کی طرف گفتگو کا رخ موڑیں گے، جو موجودہ حالات کے تناظر میں ہمارے نزدیک مسلمانوں اور قادیانیوں دونوں کے لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اور قادیانی قیادت کے لیے لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا مشتاق احمد چنیوٹی نے قادیانی لٹریچر کی دو اہم کتابوں ''سیرت المہدی'' اور ''براہینِ احمدیہ'' کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک اعلان کیا کہ وہ اسلام کی حقانیت پر پچاس جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھیں گے جس میں اسلام پر کیے جانے والے تمام اعتراضات کا جواب دیں گے۔ اس کتاب کے لیے انہوں نے اپنے عقیدت مندوں سے کتاب کی اشاعت کے لیے پیشگی قیمت اور چندہ بھی وصول کیا اور بار بار اعلان کرتے رہے کہ ''براہینِ احمدیہ'' کی پچاس جلدیں وعدہ کے مطابق شائع ہوں گی۔ لیکن بات چار جلدوں سے آگے نہ بڑھ سکی اور چوتھی جلد کی اشاعت کو جب بیس سال گزر گئے اور کوئی نئی جلد نہ آئی تو لوگوں نے تقاضہ کیا اور پیشگی قیمت و چندہ دینے والوں نے اعتراض کیا، اس پر انہوں نے چوتھی جلد کی اشاعت کے اکیس سال بعد ''براہینِ احمدیہ'' کی پانچویں جلد شائع کی تو اس کے دیباچے میں یہ لکھ کر معاملہ نمٹا دیا کہ

> ''پہلے پچاس حصے لکھنے کا ارادہ تھا مگر پچاس سے پانچ پر اکتفا کیا گیا ہے اور چونکہ پچاس اور پانچ کے عدد میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے اس لیے پانچویں حصوں سے وہ وعدہ پورا ہو گیا ہے''۔

خود جماعت احمدیہ کی شائع کردہ ''براہینِ احمدیہ'' کے پانچویں حصے کے دیباچے میں یہ اعتراف انہی الفاظ کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ مگر ہم اس سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے قادیانی مذہب کی سوسالہ

تاریخ کی دوسری ناکامیوں کا تذکرہ کرنا چاہیں گے جن میں سے ایک کا ذکر مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے کیا ہے، جبکہ دوسری کا حوالہ پاکستان کے سابق وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں دیا تھا۔

علامہ اقبالؒ کے خوشہ چین سیّد نذیر نیازی مرحوم اپنی کتاب ''اقبالؒ کے حضور'' میں علامہ اقبالؒ کے ساتھ ایک مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاعرِ مشرق کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ قادیانی حضرات اگرچہ ہم مسلمانوں کو عقیدتاً کافر سمجھتے ہیں مگر اس کے باوجود اتحاد کے بھی خواہش مند ہیں اس لیے کہ ہندو بہرحال ہم سب کو ایک سمجھتے ہیں۔ اس پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ

> ''یہ خوب منطق ہے، اسلام کی بنا پر تو ہم ایک ہیں نہ ایک ہوسکتے ہیں، البتہ ایک ہیں اور ہوسکتے ہیں تو ہندوؤں کے اس کہنے پر کہ ہم سب مسلمان ہیں''۔

اور پھر فرمایا کہ

> ''دراصل ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو قادیانیوں کا مسلمان ہونا تسلیم کرلیں البتہ وہ ہمیں برابر کافر سمجھتے ہیں، یہ کیا خوب بنائے اتحاد ہے''۔

اس کے ساتھ ہی علامہ اقبال کا ایک اور ارشاد بھی شامل کرلیں جو انہوں نے سید نذیر نیازی مرحوم کے نام ایک خط میں فرمایا ہے کہ

> 'ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں، یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے''۔

علامہ اقبالؒ کے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ قادیانی حضرات مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات اور وحی پر ایمان بھی رکھنا چاہتے ہیں اور اس پر ایمان نہ لانے والوں کو کافر قرار دینے پر بھی مصر ہیں، مگر اس کے باوجود مسلمانوں میں شامل بھی رہنا چاہتے ہیں اور مسلمان کہلانے پر ان کا اصرار بھی جاری ہے، جبکہ علامہ اقبالؒ کے بقول اسلام کی بنا پر ہم اور قادیانی نہ ایک ہیں اور نہ ہی ایک ہوسکتے ہیں۔

چنانچہ گزشتہ ایک سو برس سے قادیانیوں کی یہ پالیسی چلی آرہی ہے کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی

نبوت اور تمام دعاوی پر یقین رکھتے ہوئے بھی خود کو ملتِ اسلامیہ میں شامل رکھنے اور مسلمان کہلانے کی مسلسل ناکام کوشش کر رہے ہیں لیکن دنیائے اسلام میں کسی جگہ بھی ان کے اس موقف کو پذیرائی نہیں ملی۔ مسلمانوں کا کوئی طبقہ انہیں مسلمانوں کا حصہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، اور قادیانیوں کی ایک سو سال کی پیہم جدوجہد کے باوجود آج بھی دنیا بھر میں صورتحال یہی ہے کہ قادیانی حضرات اگر مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت و دعاوی سے براءت کا اعلان کرتے ہوئے مسلمانوں کے اجتماعی عقائد کی طرف واپس آجائیں تو دنیا کا ہر مسلمان انہیں سینے سے لگانے کے لیے تیار ہے۔ لیکن اپنے جداگانہ عقائد پر قائم رہتے ہوئے مسلمان کہلانے کی کوشش میں انہیں دنیا کے کسی حصے کے کسی مسلمان طبقے کی حمایت حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، اور اس سلسلہ میں قادیانی مذہب کے افراد جو کچھ بھی کر رہے ہیں، وقت اور صلاحیتوں کے ضیاع کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

دوسری بات کا ذکر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی یادداشتوں میں ملتا ہے کہ ان کی شہادت سے قبل ان کے آخری ایام میں اڈیالہ جیل میں ان کی نگرانی کرنے والے فوجی آفیسر کرنل رفیع الدین نے "بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن" کے نام سے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ بھٹو صاحب مرحوم اس دوران ان سے ملاقاتوں میں قادیانیوں کا اور ان کے بارے میں اپنے فیصلے کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اسی موقع پر جہاں ایک بات یہ کہی کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اور عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے بارے میں ان کا فیصلہ آخرت میں ان کی نجات اور گناہوں کی معافی کا باعث ہوگا، وہاں یہ بھی کہا کہ رفیع! یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کو پاکستان میں وہ مرتبہ دیں جو یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہے، یعنی ہماری ہر پالیسی ان کی مرضی کے مطابق چلے۔

بھٹو صاحب مرحوم انتہائی ذہین اور معاملہ فہم سیاسی راہنما تھے اور میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ اگر بعض ذاتی قسم کی کمزوریاں ان پر غالب نہ آجاتیں تو قائداعظمؒ کے بعد ان سے زیادہ باشعور، حوصلہ مند، قومی حمیت سے بہرہ ور لیڈر قوم کو میسر نہیں آیا۔ انہوں نے قادیانیوں کی نفسیات کا بالکل صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ یہ مختصر سا مذہبی گروہ پاکستان میں وہی حیثیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو امریکہ میں یہودیوں نے حاصل کر رکھی ہے کہ تمام فیصلہ ساز اداروں میں یہودی کلیدی مقام پر فائز ہیں اور امریکہ کی تمام پالیسیوں کا کنٹرول ان کے ہاتھ میں ہے۔ قادیانیوں نے پاکستان بننے کے بعد مسلسل اس بات

کی کوشش کی ہے کہ قومی اداروں اور پالیسی ساز حلقوں میں وہ کلیدی پوزیشن حاصل کر لیں، اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ''کی پوسٹوں'' پر ہر طرف قادیانی ہی قادیانی نظر آتے تھے۔ اس کے لیے سابق وزیرخارجہ چودھری ظفر اللہ خان اور یحییٰ خان کے دستِ راست ایم ایم احمد نے اپنے اپنے دور میں انتہائی متحرک کردار ادا کیا۔ لیکن ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں کی بیداری اور بروقت اقدامات کے باعث قادیانیوں کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

قادیانی گروہ اس ناکامی پر مسلسل پیچ و تاب کھا رہا ہے اور اسے ایک بار پھر کامیابی میں بدلنے کے لیے متحرک ہے۔ ان کے استعماری سرپرست مسلسل ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے دستوری فیصلے کو غیر مؤثر بنانے کے لیے بین الاقوامی طاقتیں پاکستان کی نئی حکومت پر دباؤ بڑھاتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن کیا ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے پیروکاروں کی حکومت میں ایسا ہو سکے گا؟ میرا خیال ہے کہ اس محاذ پر ایک اور ناکامی قادیانیوں کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار کر رہی ہے۔

الطاف حسین کے مغالطے

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۴ستمبر ۲۰۰۹ء)

قادیانیوں کے بارے میں متحدہ قومی موومنٹ کے سربراہ جناب الطاف حسین کے ایک انٹرویو کے بارے میں اخبارات میں اظہارِ خیال کا سلسلہ جاری ہے اور مختلف دینی حلقوں کی طرف سے اس پر سخت ردِعمل کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

مختلف وجوہ کی بنا پر قادیانیت کا مسئلہ پاکستان کے دینی حلقوں کے ہاں بہت زیادہ حساس مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملک کے عوام اور دینی جماعتوں کے نزدیک اس حوالہ سے کسی بھی طرف سے لچک کا اظہار عام طور پر قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ یہ صرف روایتی دینی حلقوں کی بات نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ حلقوں کے جذبات بھی اس کے بارے میں روایتی دینی حلقوں سے مختلف نہیں۔ چنانچہ مفکرِ پاکستان علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے قادیانیوں کے بارے میں جس لہجے میں بات کی ہے، اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ اس مسئلہ پر اپنی تاریخی خط وکتابت میں قادیانیوں کے عقیدہ وفلسفہ کو جس شدت کے ساتھ مسترد کیا ہے، وہ برصغیر کے کسی بھی معروف روایتی مذہبی رہنما کے لب ولہجے سے مختلف نہیں ہے۔

ایک دوست نے مجھے فون پر جناب الطاف حسین کے مذکورہ انٹرویو کا متعلقہ حصہ سنایا ہے، اس میں اگرچہ الطاف حسین نے کہا ہے کہ انہوں نے قادیانیوں کا لٹریچر پڑھا ہے، لیکن ہمارے خیال میں انہوں نے تکلفاً یہ بات کہہ دی ہے۔ ورنہ اگر انہوں نے قادیانیوں کا لٹریچر پڑھا ہوتا، نیز قادیانیوں اور مسلمانوں کی کشمکش کی ایک سو سالہ تاریخ پر نظر ڈال لی ہوتی، یا کم از کم قادیانیوں کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ کے خیالات وجذبات سے آگاہی حاصل کر لی ہوتی تو وہ قادیانیوں کی حمایت میں اس قدر آگے نہ جاتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جناب الطاف حسین قادیانیوں اور مسلمانوں کی کشمکش کے موجودہ تناظر کے بارے میں چند مغالطوں کا شکار ہیں، اس وقت ہم انہی مغالطوں کا تذکرہ اور ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، اس امید پر کہ الطاف حسین اور ان کے پیروکار ان گزارشات پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور قادیانیوں کے بارے میں اپنے موقف کا از سرِ نو جائزہ لیں گے۔

قادیانیوں کے بارے میں دیگر بہت سے حضرات کی طرح الطاف حسین بھی اس مغالطے کا شکار لگتے ہیں کہ یہ کوئی فرقہ وارانہ قسم کا مذہبی مسئلہ ہے جس میں مولوی حضرات خوامخواہ شدت پسندی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، لیکن حقیقت میں ایسی بات نہیں ہے۔ علامہ محمد اقبال مرحوم کے ارشاد کے مطابق قادیانی گروہ نئی نبوت کے عنوان سے امت کا مرکزِ اطاعت تبدیل کر رہا ہے، اس لیے کہ وحی کے نزول کی وجہ سے نئے نبی کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے اور اطاعت کا سابقہ نظام تبدیل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی یہی دعویٰ کیا ہے کہ چونکہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے اس لیے اب ان کی اطاعت واجب ہے، ان کی اطاعت کو قبول کیے بغیر کوئی شخص ان کے بقول مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اسی وجہ سے قادیانی حضرات مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان نہ لانے والے دنیا بھر کے سوا ارب سے زیادہ مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔

جبکہ مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں کا معاملہ اس سے قطعی طور پر مختلف ہے، وہ آپس میں جس قدر بھی اختلاف رکھتے ہوں مگر ان کا مرکزِ اطاعت صرف جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے اور وہ اپنی کسی بھی بات کے لیے حوالہ وہیں سے پیش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس قادیانیوں کا مرکزِ اطاعت مرزا غلام احمد قادیانی ہیں اور وہ اپنی بات بزعمِ خود وحی کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں۔ اس لیے مرکزِ ایمان اور مرکزِ اطاعت الگ الگ ہونے کی وجہ سے مسلمان اور قادیانی دو الگ الگ مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا قادیانی گروہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں میں سے نہیں بلکہ امتِ مسلمہ کے مقابلے پر ایک نئے مذہب کے پیروکار ہیں۔ الطاف حسین قادیانیوں کے مسئلہ کو مسلمانوں کے داخلی فرقوں کے تناظر میں نہیں بلکہ نئی نبوت اور نئی وحی کے ساتھ ایک نئے مذہب کے آغاز کے طور پر دیکھیں اور اس کے لیے علامہ محمد اقبالؒ سے رہنمائی حاصل کریں، ان کا یہ مغالطہ بہت جلد دور ہو جائے گا۔

متحدہ قومی موومنٹ کے قائد غالباً اس مغالطے کا بھی شکار نظر آتے ہیں کہ قادیانی گروہ پاکستان کا کوئی نارمل سا مذہبی گروہ ہے جس کے جائز مذہبی حقوق کو اکثریتی مذہبی فرقے پامال کر رہے ہیں۔ یہ بات بھی غلط ہے اس لیے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً ابعد سے قادیانی گروہ مسلسل اس کوشش میں ہے کہ ملک میں اقتدار کے سرچشموں تک ان کی رسائی ہو اور وہ ملک کی اکثریت پر تسلط قائم کر کے ملک کو

اپنی مرضی کے ساتھ چلائے۔ باقی تمام باتوں سے قطع نظر صرف یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں ہے کہ کوئی ایسا گروہ جو ملک کی آبادی میں بہت تھوڑی تعداد رکھتا ہے، اقتدار پر قبضہ کرنے اور ملک کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی سازش کرے۔ جیسا کہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے کہا تھا کہ قادیانی گروہ پاکستان میں وہی حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے کہ ملک کی کوئی پالیسی ان کی مرضی کے بغیر طے نہ ہو سکے۔ الطاف حسین جمہوریت کی بات کرتے ہیں اس لیے انہیں اس بات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیے کہ ایک چھوٹی سی اقلیت بھٹو مرحوم کے بقول پورے ملک کے اقتدار پر تسلط اور ملک کی پالیسیوں پر کنٹرول حاصل کرنے کی سازش کرتی چلی آ رہی ہے، اور الطاف حسین اس حوالہ سے اس گروہ کے ماضی اور پوری تاریخ کو نظر انداز کر کے اس کی پشت پناہی کرنا چاہ رہے ہیں۔

الطاف حسین کے ذہن پر اس مغالطے کی پرچھائیاں بھی صاف دکھائی دے رہی ہیں کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ پاکستان کے صرف مولوی طبقہ کا ہے۔ اور چونکہ الطاف حسین کو مولویوں کی کسی بات سے اتفاق نہیں اس لیے وہ اسے بھی مسترد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل صورتحال یہ نہیں ہے، قادیانیوں کے بارے میں علماء کرام کا اصل اور روایتی موقف تو یہ تھا کہ وہ مرتد ہیں اور مرتد شرعی احکام کی رو سے ایک اسلامی ریاست میں زندگی کا مستحق نہیں رہتا۔ اس کے لیے پاکستان کے پہلے شیخ الاسلام حضرت مولانا علامہ شبیر احمدؒ عثمانی کا رسالہ ''الشہاب'' ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے اس سے اتفاق نہ کرتے ہوئے قادیانیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت کی حیثیت سے معاشرتی طور پر قبول کرنے کی تجویز پیش کی تھی، جس سے پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام نے اتفاق کر لیا اور قادیانیوں کو گردن زدنی قرار دینے کی بجائے صرف غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ جس پر ایک طویل جدوجہد کے بعد ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قیادت میں دستوری طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا۔ الطاف حسین سے گزارش ہے کہ وہ اس تاریخی حقیقت کو ذہنی طور پر قبول کریں کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ اصل میں مولویوں کا نہیں بلکہ علامہ محمد اقبالؒ کا ہے، ملک کی منتخب پارلیمنٹ کا ہے، اور جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور ان کی پیپلز پارٹی کا ہے۔

الطاف حسین کے انٹرویو میں اس مغالطے کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے کہ قادیانیوں کے خلاف یہ فیصلہ صرف پاکستان کے علماء کرام کا ہے اور پاکستان کے علماء کرام کے بارے میں الطاف حسین کے دل میں غصے کی لہر ہر وقت موجود رہتی ہے۔ یہ بات بھی سراسر مغالطے پر مبنی ہے اس لیے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا فیصلہ دنیا بھر کے تمام مسلم علمی حلقوں اور دینی مراکز کا متفقہ فیصلہ ہے۔ اگر الطاف حسین کو کوئی شک ہے تو وہ عالمِ اسلام کے کسی بھی معروف دینی و علمی مرکز سے استفسار کر کے دیکھ لیں انہیں وہی جواب ملے گا جو پاکستان کے علماء کرام کہتے ہیں۔

الطاف حسین کی یہ شکایت بھی مغالطے پر ہی مبنی ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کے انسانی اور شہری حقوق پامال کیے جا رہے ہیں۔ جبکہ اصل جھگڑا قادیانیوں کے انسانی حقوق کی بحالی کا نہیں بلکہ ان کے تعیُّن کا ہے، اس لیے کہ قادیانی گروہ اپنی وہ حیثیت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے جو ملک کے دستور و قانون نے ان کے لیے طے کر رکھی ہے۔ وہ دستور و قانون کو مسترد کرتے ہوئے اپنے لیے غیر مسلم اقلیت کے طور پر نہیں بلکہ ایک اسلامی فرقے کے طور پر حقوق حاصل کرنے کے درپے ہیں، جو دستور و قانون یا اخلاق و شریعت کسی بھی حوالے سے درست بات نہیں ہے۔ وہ اپنے سوا کسی کو مسلمان ہی تسلیم نہیں کرتے جبکہ پاکستان کے تمام مسلمان متفقہ طور پر انہیں غیر مسلم قرار دیتے ہیں۔

اس صورتحال میں مسلمانوں میں شامل ایک گروہ کے طور پر ان کا وجود اور ان کے حقوق آخر کیسے تسلیم کیے جا سکتے ہیں؟ جہاں تک غیر مسلم اقلیت کے طور پر دیگر غیر مسلم اقلیتوں کی طرح شہری اور مذہبی حقوق کا تعلق ہے، ملک کے دینی حلقوں کو ان سے نہ پہلے کبھی انکار رہا ہے اور نہ ہی وہ اس سے اب انکار کر رہے ہیں۔ میں الطاف حسین کو یاد دلانا چاہوں گا کہ مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا شاہ احمد نورانیؒ جیسے بزرگ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور میں ایک قادیانی اقلیتی رکن اسمبلی کے ساتھ ایوان میں بیٹھتے رہے ہیں، تو آج ان کے پیروکاروں کو قادیانیوں کے جائز حقوق سے انکار کیوں ہوگا؟

الطاف حسین نے اس انٹرویو میں کہا ہے کہ قادیانیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے علامہ اقبالؒ کے خیالات کے خلاف ہو رہا ہے۔ مگر میں یہ عرض کروں گا کہ یہ سب کچھ علامہ اقبالؒ کی مرضی اور موقف کے مطابق ہی ہو رہا ہے، الطاف حسین سے گزارش ہے کہ وہ قادیانیوں سے علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز اور موقف قبول کرا لیں، میں پوری ذمہ داری کے ساتھ انہیں یقین دلاتا ہوں کہ علامہ محمد اقبالؒ کے

موقف کے مطابق قادیانیوں کے حقوق کی بحالی اور احترام کی مہم میں ہم ان کے ساتھ ہوں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا دعوائے نبوت

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۱اپریل ۲۰۱۱ء)

......ایک سوال یہ کہ کسی شخص کو نبی کہہ دینے سے آخر کیا فرق پڑ جاتا ہے؟ ہم بھی تو اپنے بزرگوں کو بھاری بھرکم القابات سے نوازتے رہتے ہیں جو بسا اوقات خوفناک حد تک بھاری بھرکم ہو جاتے ہیں۔ اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے جو علماء کرام علمی حوالوں سے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں ایک صدی سے دیتے آرہے ہیں اور بڑے بڑے اہلِ علم نے اس کے لیے محنت کی ہے۔ یہ علمی اور تحقیقی جوابات اپنی جگہ درست اور ضروری ہیں لیکن ایک جواب علامہ محمد اقبالؒ نے دیا تھا جو کامن سینس میں ہے اور آج کی دنیا کے لیے زیادہ قابلِ فہم ہے۔ انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ خط وکتابت میں کہا تھا کہ نبی چونکہ اللہ تعالیٰ کا براہ راست نمائندہ ہوتا ہے اور اس کی ہر بات حجت ہوتی ہے اس لیے کسی کو نبی مان لینے سے وفاداری کا مرکز تبدیل ہو جاتا ہے اور پہلا نبی وفاداری کا مرکز نہیں رہتا۔

اس کی مثال عرض کرتا ہوں کہ جیسے ہم سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی اور رسول مانتے ہیں اور بحیثیت نبی اور رسول ان پر ایمان رکھتے ہیں، ان کی کتاب توراۃ کو بھی مانتے ہیں اور کتابِ حق تصور کرتے ہیں، لیکن وہ ہمارا مرکزِ وفاداری نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ہم ان کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسول مانتے ہیں اور ہماری تمام تر وفاداری کا مرکز آپؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔ حتیٰ کہ ہم قرآن کریم کی آیات بھی وہی مانتے ہیں جن کو آنحضرتؐ نے قرآن کریم کی آیات قرار دیا ہے، اور حضرت موسیٰؑ اور تورات کی بھی وہی باتیں مانتے ہیں جن کی جناب نبی اکرمؐ کی تعلیمات میں تصدیق موجود ہے۔

علامہ اقبالؒ نے کہا کہ چونکہ مرزا غلام احمد قادیانی کا کہنا کہ وہ نبی ہے، اس پر وحی آتی ہے اور وہ خدا کا نمائندہ ہے، اس لیے اس کو ماننے والوں کا مرکزِ وفاداری وہی ہے اور وہ قرآن وسنت کی باتوں کو اسی معنٰی ومفہوم میں مانتے ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی نے بیان کیا ہے، چنانچہ ان کا مرکزِ وفاداری مرزا

غلام احمد ہے، حتیٰ کہ اس طرح قادیانی جماعت نے ملتِ اسلامیہ کے مرکزِ وفاداری کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ امتِ مسلمہ کا مرکزِ وفاداری جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، کل بھی وہی تھے، آج بھی وہی ہیں اور قیامت تک وہی رہیں گے۔ وحی اور نبوت کے عنوان سے امت کا مرکزِ وفاداری تبدیل کرنے کوئی کوشش امت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔......

علامہ محمد اقبالؒ اور قادیانیت: عمار خان ناصر کا موقف

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ ستمبر ۲۰۱۱ء)

...... عمار خان نے اسلامی نظریاتی کونسل کے رسالہ ''اجتہاد'' میں اجتہادی رویوں اور دینی تحریکات کی حکمتِ عملی کے حوالے سے ایک مضمون لکھا جو ''اجتہاد'' کے بعد ماہنامہ الشریعہ کے دسمبر ۲۰۱۰ء کے شمارہ میں بھی شامل ہوا۔ اس میں اس نے قادیانیوں کے بارے میں اختیار کی جانے والی حکمتِ عملی کے حوالے سے لکھا کہ:

''اگر کسی معاشرے میں کشف و الہام انفرادی دائرے سے اٹھ کر ایک باقاعدہ اداراتی صورت اختیار کر چکے ہوں، ان کی بنیاد پر شخصیات اور جماعتوں کے عند اللہ مقبول ہونے یا نہ ہونے کے فیصلے کیے جاتے ہوں، لوگوں کو ان کی طرف دعوت جاتی اور ان کے ساتھ وابستہ ہونے والوں کو نجات کی بشارت دی جاتی ہو، القا و الہام کی بنیاد پر مراقبہ و سلوک کے نظام مرتب کیے جاتے بلکہ سیاسی و مذہبی اختلافات میں بھی حق و باطل کی تفریق کرنا ایک عام چلن ہو، جہاں خواب اور بشارات کسی کے مامور من اللہ ہونے کا ایک مستند ذریعہ سمجھے جاتے ہوں، ایسی فضا میں اگر کوئی شخص ''شبانی سے کلیمی دو قدم ہے'' کا نعرۂ مستانہ بلند کر دے اور عام لوگ اس کے فریب میں مبتلا ہو کر اسے ایک ''امتی نبی'' مان لیں تو انہیں کس حد تک اس کا قصور وار ٹھہرایا جا سکتا اور راہ راست پر لانے کی ہمدردانہ کوشش کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے محض ان کا معاشرتی مقاطعہ کرنے اور قانونی اقدامات کے ذریعے سے انہیں مسلمانوں سے الگ کر دینے پر اکتفا کے طرزِ عمل کو کس حد تک اخلاق، حکمت اور دعوتِ دین کے تقاضوں کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے؟'' (الشریعہ، دسمبر ۲۰۱۰ء، ص ۴۸)

عزیزم عمار کی اس عبارت پر ملک کے مختلف دینی جرائد میں تبصرہ شائع ہوا ہے اور اس عبارت سے یہ مطلب اخذ کیا گیا ہے کہ ''امتی نبی'' ہونا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے اور قادیانیوں کے

معاشرتی مقاطعہ اور ان کے خلاف قانونی اقدامات کا طرزِ عمل درست نہیں ہے۔ حالانکہ تھوڑے سے غور وخوض کے بعد یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ اس عبارت میں:

- تصوف میں مبالغہ آرائی کی بعض صورتوں پر طنز کیا گیا ہے جو خود میرے نزدیک بھی مناسب بات نہیں ہے، یہ بات اس سے بہتر اسلوب میں بھی کہی جاسکتی تھی۔
- اس طرزِ عمل کو عام مسلمانوں کے قادیانی فریب سے متاثر ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔
- اور فریب کاری سے متاثر ہونے والے سادہ لوح مسلمانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہیں ہمدردی کے ساتھ اس فریب سے نکالنے اور اسلام میں واپس لانے کی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں۔

یہ مضمون الشریعہ کے دسمبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، جبکہ اس سے قبل مارچ ۲۰۱۰ء کے شمارے میں مولانا مشتاق احمد چنیوٹی کی تصنیف ''اقبالؒ اور قادیانیت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے عمار خان اپنا یہی موقف ان الفاظ میں لکھ چکا ہے کہ:

> ''انیسویں صدی کے آخر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی ظلی نبوت کے عنوان سے برصغیر میں ایک نیا باب الفتن کھولا تو سادہ لوح عوام کو اس کے دجل وفریب سے آگاہ کرنے کے لیے اہلِ حق کو میدان میں آنا پڑا اور اہلِ علم نے علمی وتحقیقی اور مناظرانہ ومجادلانہ، ہر دو انداز میں پوری مستعدی سے قادیانی نبوت کی تاویلات وتحریفات کا پردہ چاک کیا۔ اہلِ دین کی کم وبیش پون صدی کی مسلسل جدوجہد قادیانی فرقے کو عالمِ اسلام میں قانونی اور آئینی سطح پر غیر مسلم قرار دینے پر منتج ہوئی۔ اس تحریک کی قیادت اور راہ نمائی بنیادی طور پر علماء نے کی، تاہم اس کی کامیابی میں بہت سی ایسی شخصیات کا حصہ بھی کم نہیں جو روایتی مذہبی حلقے کی نمائندہ نہیں سمجھی جاتیں۔ ان شخصیات میں علامہ محمد اقبالؒ کا نام سرِفہرست ہے۔
>
> قادیانی گروہ نے اپنی معاشرتی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے لوگوں کو مذہبی تاویلات اور گورکھ دھندوں میں الجھانے کے ساتھ ساتھ کئی سیاسی اور سماجی عوامل کا بھی سہارا لینے کی کوشش کی۔ برصغیر کی فضا مختلف مذہبی گروہوں کی طرف سے ایک

دوسرے کی تکفیر کے واقعات سے مانوس تھی، جبکہ مرزا غلام احمد دعوائے نبوت سے پہلے کئی سال تک ہندوؤں اور عیسائیوں کے مقابلے میں دفاعِ اسلام کے محاذ پر محنت کر کے اپنے حق میں ہمدردی کی فضا بڑے پیمانے پر پیدا کر چکے تھے، چنانچہ جب ان کے دعوائے نبوت پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا تو ایک وقت تک ناواقف مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اسے روایتی مذہبی فتوے بازی ہی کا ایک نمونہ سمجھتی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف انگریز سرکار بلکہ اسلام سے محض نسبت کا تعلق رکھنے والے نام نہاد لبرل طبقات کی ہمدردیاں بھی اس نوزائیدہ گروہ کو حاصل تھیں۔ اس تناظر میں علامہ اقبالؒ جیسی قد آور اور معتبر ملی شخصیت کا قادیانی نبوت کے خلاف دو ٹوک اور واضح موقف اختیار کرنا ان تمام طبقات پر مذہبی علماء کے موقف کا وزن واضح کرنے میں بے حد مؤثر ثابت ہوا جو کسی بھی وجہ سے اس معاملے میں تردّد یا دوذہنی کا شکار تھے۔

زیر نظر کتابچہ میں مولانا مشتاق احمد چنیوٹی نے، جو اس موضوع کے متخصّص ہیں، قادیانیت کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ کی تحریروں، گفتگوؤں اور بیانات کا ایک مختصر مگر نمائندہ انتخاب جمع کر دیا ہے جو اس حوالے سے ان کے زاویۂ نظر اور استدلال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اقبالؒ کے طرز استدلال کا ایک امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے عقیدۂ ختم نبوت کے حوالے سے مسلمانوں کا مقدمہ خالص کلامی بنیاد پر پیش کرنے کے بجائے اپنے مخاطب طبقات کی ذہنی رعایت سے، اس عقیدے کی اہمیت کو سماجی اصولوں کی روشنی میں واضح کیا اور یہ بتایا کہ بحیثیت ایک گروہ کے مسلمانوں کے مذہبی تشخص کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے اور اس کی حفاظت کے لیے یہ ان کا مذہبی، اخلاقی اور جمہوری حق ہے کہ کسی نئی نبوت پر ایمان لانے والے گروہ کو ان کا حصہ سمجھنے کے بجائے ایک نیا مذہبی گروہ قرار دے کر قانونی اعتبار سے ان سے الگ کر دیا جائے۔ (ص ۱۶، ۱۷)

اسی طرح انہوں نے قادیانی گروہ پر زندقہ و ارتداد کے روایتی فقہی احکام (یعنی سزائے موت) جاری کرنے کے بجائے جدید جمہوری تناظر میں یہ تجویز کیا کہ قادیانیوں

کو ایک الگ جماعت تسلیم کر لیا جائے اور پھر مسلمان ان کے بارے میں ویسے ہی مذہبی اور معاشرتی رواداری سے کام لیں گے جیسے وہ دوسرے مذاہب کے بارے میں لیتے ہیں (ص ۱۱)۔ یہ بات اس پہلو سے بہت اہم اور حکیمانہ تھی کہ قانونی تکفیر کے باوجود اس سے آگے چل کر ان ہزاروں لوگوں کے لیے اسلام کی طرف واپسی کا راستہ کھلا رہتا جو مختلف وجوہ سے قادیانیت کے پُرفریب جال کا شکار ہو کر جادۂ حق سے بھٹک گئے، جبکہ موجودہ صورتحال میں مسلمان مناظرین کے اختیار کردہ لب و لہجہ اور طرزِ استدلال نیز قادیانیوں کی نئی نسل کا مسلمانوں کے ساتھ اختلاط بالکل مفقود ہونے کی وجہ سے یہ راستہ کم و بیش بند دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ مرزا طاہر احمد کے دستِ راست حسن محمود عودہ نے بیس سال قبل اپنے قبولِ اسلام کے موقع پر ایک انٹرویو میں قادیانی امت کے اپنی گمراہی پر قائم رہنے کا ایک بڑا سبب اس چیز کو قرار دیا تھا کہ ان کی مسلمان علماء تک رسائی نہیں ہے اور قادیانی قیادت اس خلیج کو برقرار رکھنے میں ہی اپنا بھلا سمجھتی ہے۔"

"الشریعہ" کے مارچ ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اس تفصیلی موقف پر نظر ڈالنے کے بعد دسمبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہونے والے مضمون کے اس اجمالی اقتباس کو پھر سے ملاحظہ فرمالیا جائے کہ اس میں قادیانیوں کی حمایت کی گئی ہے یا ان کے فریب کا شکار ہونے والے سادہ لوح مسلمانوں کو فریب کے اس دائرے سے ہمدردی کے ساتھ نکال لانے کی بات کہی گئی ہے؟ ہم تو ان دوستوں سے صرف یہی عرض کر سکتے ہیں کہ "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد"۔

مسئلہ قادیانیت کے تین پہلو

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء)

۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء کو شالامار چوک لاہور میں عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے زیر اہتمام ’’ختمِ نبوت کانفرنس‘‘ منعقد ہو رہی ہے جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور دینی و سیاسی رہنما خطاب کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس سلسلہ میں لاہور کے مختلف حصوں میں کانفرنس کی تیاری کے لیے علاقائی سطح پر اجتماعات منعقد ہو رہے ہیں۔ ۱۵ اپریل کو سبزہ زار اسکیم کے بلاک ایل میں سابق ایم این اے چودھری محمد ارشاد ڈوگر کی رہائشگاہ کے وسیع لان میں مجلسِ صوت القرآن کے زیر اہتمام ایک اجتماع منعقد ہوا جس میں راقم الحروف کو عقیدۂ ختمِ نبوت کی اہمیت اور اس کے لیے جدوجہد کی ضرورت کے موضوع پر کچھ معروضات پیش کرنے کے لیے کہا گیا، اس موقع پر جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ نذرِ قارئین ہے:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مجھے عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کے حوالے سے کچھ عرض کرنے کے لیے کہا گیا ہے، اس کے دو پہلو ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ اسلام میں عقیدۂ ختمِ نبوت کی اہمیت اور مسلمانوں کے اس سلسلہ میں جذبات و احساسات کا دلائل اور تاریخ کے تناظر میں ذکر کیا جائے۔

۲۔ اور دوسرا یہ کہ آج کے دور میں عقیدۂ ختمِ نبوت کے بارے میں اس عقیدہ کے منکرین کی طرف سے جو چیلنج در پیش ہے اسے واضح کیا جائے اور مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ دلائی جائے۔ میں آج کی گفتگو میں اس دوسرے پہلو پر چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

جنوبی ایشیا کے کسی حصہ میں عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کے اس پہلو پر جب بات ہوتی ہے تو قادیانیت کا تذکرہ لازمی سمجھا جاتا ہے کیونکہ گزشتہ کم و بیش سوا سو برس سے قادیانیت ہی کو عقیدۂ ختمِ نبوت سے انکار کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ علمائے اسلام اور دینی جماعتوں کی کشمکش جاری ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام نے متفقہ طور پر

انہیں اور ان کے پیروکاروں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا اور اعلان کیا کہ نئی نبوت کے دعویٰ کے ساتھ وجود میں آنے والے اس گروہ کا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اس اجتماعی موقف کو پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے ۱۹۷۴ء میں دستوری ترمیم کے ذریعے ملک کے دستور کا حصہ بنا دیا، اور مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کو ملکی دستور و قانون کی رو سے غیر مسلم اقلیتوں میں شامل کر دیا۔ جبکہ قادیانیوں نے اس فیصلے کو قبول کرنے سے نہ صرف انکار کر رکھا ہے بلکہ دنیا بھر میں وہ پاکستانی پارلیمنٹ کے اس متفقہ اور جمہوری فیصلے کے خلاف لابنگ اور پروپیگنڈا کے ذریعے مہم جاری رکھے ہوئے ہیں اور اسے منسوخ کرانے کے لیے ہر سطح پر اپنا پورا زور لگا رہے ہیں۔

میں اس تناظر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ قادیانیت کے مسئلہ پر مختصر گفتگو کروں تاکہ جو لوگ واقف نہیں ہیں انہیں اس مسئلہ کی سنگینی کا اندازہ ہو جائے۔ مسئلہ قادیانیت کے تین پہلو ہیں۔ ایک علمی و دینی، دوسرا سماجی اور تیسرا سیاسی۔ جبکہ قادیانیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ان تینوں پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے:

مذہبی، علمی اور دینی پہلو تو یہ ہے کہ قادیانیت کے آغاز اور مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں ہی حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ جیسے اکابر اہلِ علم نے اس کا نوٹس لیا اور دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور شیعہ مکاتبِ فکر کے تمام علماء نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اعلان کیا۔ جبکہ عوامی سطح پر امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور دیگر علماء کرام نے اس سلسلہ میں عوامی بیداری کی مہم چلائی۔ علمائے برصغیر کا یہ فتویٰ اور فیصلہ صرف ان کا نہیں ہے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے تمام دینی مکاتبِ فکر اور علمی مراکز کا متفقہ فیصلہ ہے، اور دنیا بھر میں مسلمانوں کا کوئی بھی مسلّمہ مذہبی حلقہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس فیصلے سے اتفاق نہ رکھتا ہو اور اس کی کھلے بندوں تصدیق اور تائید نہ کرتا ہو۔

قادیانیوں نے یہ کہہ کر اس فیصلہ کی اہمیت کو ہر دور میں کم کرنے کی کوشش کی ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر ایک دوسرے کو بھی کافر کہتے ہیں اور ایسے فتووں کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن ہر موقع پر مسلمان مکاتبِ فکر کے علماء کرام نے باہم مل کر اس کی دوٹوک وضاحت کی ہے کہ ان کے آپس کے فتووں کی نوعیت مختلف ہے اور قادیانیوں کے خلاف ان سب کا متفقہ فتویٰ بالکل مختلف نوعیت کا ہے جو پوری

امتِ مسلمہ کے متفقہ اور اجماعی فیصلے کی حیثیت رکھتا ہے جس سے انکار کی کسی کے لیے گنجائش نہیں ہے۔

مسئلہ کا دوسرا پہلو سماجی ہے جس کی طرف مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے توجہ دلائی اور پھر دلائل کے ساتھ اس کو پوری طرح واضح کیا کہ نئی نبوت کا ٹائٹل امت کو تقسیم کرنے کا باعث ہوتا ہے، اس لیے کہ نبی کسی بھی مذہب میں آخری اتھارٹی ہوتا ہے اور نبی کے بدل جانے سے مذہب بدل جایا کرتا ہے۔ اس کی تھوڑی سی وضاحت میں کرنا چاہوں گا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ پر ایمان رکھنے والے یہودی کہلاتے ہیں، لیکن ان دونوں پر ایمان رکھنے کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل پر ایمان لانے والے یہودی کہلانے کے حقدار نہیں ہیں بلکہ ایک الگ اور نئے مذہب مسیحیت کے پیروکار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور جس طرح حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، توراۃ اور انجیل سب پر ایمان رکھنے کے باوجود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم پر ایمان لانے والے نہ یہودی تسلیم کیے جاتے ہیں اور نہ ہی مسیحی کہلانے کے حقدار ہیں، بلکہ ایک نئے مذہب کو قبول کرنے کے باعث مسلمان کہلاتے ہیں۔

چنانچہ اسی طرح حضرت محمدؐ اور قرآن کریم پر ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود قادیانی حضرات بزعم خود ایک نئے نبی مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی نئی وحی پر ایمان لانے کی وجہ سے مسلمان کہلانے کے حقدار نہیں ہیں، اور ان کی حیثیت ایک نئے اور الگ مذہب کے پیروکار کی ہے۔ اسی لیے ان سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ جس طرح عیسائیوں نے یہودیوں سے الگ تشخص اختیار کیا ہے، اسی طرح وہ بھی مسلمانوں سے الگ تشخص اختیار کریں اور اپنے مذہب کا نام اور اس کی علامات کو مسلمانوں کے مذہبی شعائر سے الگ کریں۔ کیونکہ الگ اور نیا مذہب رکھتے ہوئے مسلمانوں کا ٹائٹل اور اسلام کے مخصوص مذہبی شعائر کو استعمال کرنے سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے اور اس سے مسلمانوں کا اپنے مذہبی تشخص کی حفاظت کا حق مجروح ہوتا ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ نے برطانوی دورِ حکومت میں مطالبہ کیا تھا کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے ایک الگ مذہب کا پیروکار شمار کیا جائے اور غیر مسلم اقلیت کا درجہ دے کر ان کا معاشرتی تشخص مسلمانوں سے الگ کیا جائے۔ علامہ محمد اقبالؒ کی اسی تجویز کی بنیاد پر ۱۹۷۴ء میں پاکستانی پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر

مسلم اقلیت قرار دینے کا متفقہ اور جمہوری فیصلہ صادر کیا تھا۔

مسئلہ کا تیسرا پہلو سیاسی ہے اور اس کی طرف بھی سب سے پہلے علامہ محمد اقبالؒ نے ہی توجہ دلائی تھی۔ انہوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''قادیانیت یہودیت کا چربہ ہے''۔ اس کی وضاحت میں اگر مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے ان ریمارکس کو دیکھ لیا جائے تو بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے، جس کا تذکرہ بھٹو مرحوم کے قید کے ایام میں ان کی نگرانی کرنے والے فوجی افسر کرنل رفیع نے اپنی یادداشتوں میں کیا ہے کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے کہا کہ قادیانی گروہ پاکستان میں وہی حیثیت حاصل کرنے کے درپے ہے جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے کہ ملک کی کوئی پالیسی ان کی مرضی کے بغیر طے نہ ہو۔ امریکہ اور یورپ میں یہودیوں کی دخل اندازی بلکہ مغرب کی پالیسیوں پر ان کے کنٹرول کو اقبالؒ ہی نے یوں تعبیر کیا تھا کہ ع فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

آج دنیا کا ہر باشعور شخص اس سے آگاہ ہے کہ امریکہ میں سیاست، معیشت اور میڈیا تینوں پر یہودیوں کا کنٹرول ہے اور تھنک ٹینکس بھی انہی کے زیر اثر ہیں، اس لیے امریکہ کی قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں پر ان کی اجارہ داری ہے۔ حالانکہ امریکی آبادی میں یہودیوں کا تناسب بمشکل ایک فیصد ہو گا۔ بھٹو مرحوم نے اس حقیقت کو بجا طور پر سمجھا تھا اور اس کی نشاندہی کی کہ پاکستان میں یہی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے قادیانیوں کی شروع سے کوشش جاری ہے اور آج بھی وہ عالمی استعمار کی پشت پناہی کے ساتھ اس کے لیے منظم طریقے سے کام کر رہے ہیں۔

اس لیے میں تمام مسلمانوں سے یہ گزارش کروں گا کہ وہ اس معروضی صورتحال کا اچھی طرح ادراک کریں کہ قادیانیت کا مسئلہ مذہبی، علمی اور دینی ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی مسئلہ بھی ہے، اور اس سے امتِ مسلمہ کی وحدت، پاکستان کی خود مختاری، اور سالمیت کو مسلسل خطرات درپیش ہیں۔ بالخصوص آج کے اس عالمی تناظر میں بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کہ قادیانیوں کو عالمی سیکولر لابیوں کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے، اور پاکستان کے اندر قادیانیوں کے عزائم کو کامیاب بنانے کے لیے بین الاقوامی سطح پر منظم مہم چلائی جا رہی ہے۔ اس لیے عقیدۂ ختمِ نبوت اور قادیانیوں کے بارے میں دستورِ پاکستان کے فیصلے کا مسلسل پہرہ دینے کی ضرورت ہے اور یہ صرف علماء کرام کی نہیں بلکہ امت کے تمام طبقات کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

علامہ اقبالؒ کا وژن اور جمہور علمائے اسلام

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ مارچ ۲۰۱۳ء)

...... ہم اپنے محترم دانشوروں کو یاد دلانا چاہیں گے کہ پاکستان بننے کے بعد جمہور علمائے اسلام نے علامہ اقبالؒ کا وژن قبول کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے ذریعہ نفاذِ اسلام کا راستہ اختیار کیا تھا اور قادیانیوں کو مرتد قرار دے کر قتل کرنے کی بجائے ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر قبول کر لینے کا فیصلہ بھی اقبالؒ کے وژن پر ہی کیا گیا تھا۔ مگر ہمارے ان مہربان دانشوروں نے جمہور علمائے اسلام کے اس اجتہادی فیصلے کا کتنا احترام کیا ہے؟ قراردادِ مقاصد، پاکستان کی اسلامی نظریاتی شناخت، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ، ناموس رسالتؐ کے تحفظ کا قانون، اور دستور کی دیگر اسلامی دفعات منتخب پارلیمنٹ کے فیصلے ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر فیصلے پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی سرکردگی میں ہوئے ہیں، لیکن ہمارے بعض دانشوروں نے منتخب پارلیمنٹ کے ان جمہوری فیصلوں کے خلاف جو مورچہ لگا رکھا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علماء کرام تو اقبالؒ کے وژن پر آ گئے تھے، انہوں نے اقبالؒ کا وژن قبول کر کے اس کے مطابق جمہوری اسلامی ریاست کا راستہ اختیار کر لیا تھا اور جمہور علماء پاکستان آج بھی اس وژن پر قائم ہیں۔ لیکن حکمران طبقوں اور سیکولر دانشوروں نے عوام کے منتخب نمائندوں کے جمہوری فیصلوں کے خلاف جو روش گزشتہ ساٹھ برس سے اختیار کر رکھی ہے اس کے ردعمل میں اس شدت پسندی اور عسکریت نے جنم لیا ہے جو پوری قوم کے لیے اضطراب کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ہم ایک لمحہ کے لیے اس شدت پسندی اور عسکریت کے حامی نہیں ہیں، لیکن جس روش نے حالات کو یہاں تک پہنچایا ہے اسے تبدیل کیے بغیر اس پر قابو آخر کیسے پایا جا سکتا ہے؟ اس شدت پسندی اور عسکریت کے سدِباب کے لیے دستور کی اسلامی بنیادوں کو تسلیم کرنے کا اعلان کیجئے اور ان پر خلوصِ دل کے ساتھ عملدرآمد کا اہتمام کیجئے، شدت پسندی کا راستہ خود بخود بند ہو جائے گا اور ان کے لیے قوم کے اجتماعی فیصلے کے سامنے سرنڈر ہونے کے سوا کوئی آپشن باقی نہیں رہے گا......

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تجویز

(روزنامہ اسلام، لاہور۔۲۶اپریل ۲۰۱۳ء)

...... پاکستان بننے کے بعد سے ہی قادیانیوں کی معاشرتی حیثیت کے بارے میں مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کی جدوجہد کا آغاز ہوگیا تھا اور تمام مکاتبِ فکر کے اکابر علماء کرام نے مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز کے مطابق یہ متفقہ موقف اختیار کیا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو کار چونکہ مسلّمہ اسلامی عقائد کی رو سے ملتِ اسلامیہ کا حصہ نہیں ہیں اس لیے انہیں دستوری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے اور ملک کی دیگر غیر مسلم اقلیتوں کی طرح انہیں بنیادی شہری اور مذہبی حقوق کا تحفظ فراہم کیا جائے۔ مسلمانوں کی یہ جدوجہد ۱۹۷۴ء میں کامیاب ہوئی جب منتخب پارلیمنٹ نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور قائدِ حزبِ اختلاف مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیتوں میں شمار کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا۔ مگر اسے قبول کرنے سے قادیانیوں نے انکار کر دیا اور اس انکار پر ان کے اصرار نے اب تک یہ مسئلہ نہ صرف باقی رکھا ہوا ہے بلکہ اس کی شدت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ سیدھی سی بات ہے کہ پورا عالمِ اسلام قادیانیوں کو اپنے وجود کا حصہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے متفقہ دستوری فیصلے کے ذریعہ انہیں غیر مسلم اقلیتوں میں شمار کر دیا ہے۔ اسے قبول نہ کرنے کا قادیانیوں کے پاس کوئی سیاسی، قانونی اور اخلاقی جواز موجود نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود قادیانی گروہ نہ صرف اپنے انکار پر بضد ہے بلکہ پاکستان کے دستور و قانون اور مسلمانوں کے اجتماعی موقف کے خلاف عالمی سیکولر لابیوں کے ساتھ مل کر محاذ آرائی کو مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہا۔......

مسئلہ قادیانیت کا پس منظر اور علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۶ ستمبر ۲۰۱۴ء)

ستمبر کے پہلے عشرہ کے دوران ملک بھر میں دو حوالوں سے تقریبات ہوتی ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ کا آغاز اس عشرہ میں ہوا تھا اور ملک کی مسلح افواج نے دفاعِ وطن کے لیے شاندار خدمات سرانجام دی تھیں جس پر شہداء کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ ۱۹۷۴ء میں ۷ ستمبر کو پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے قادیانی مسئلہ کے حوالہ سے تاریخی فیصلہ صادر کرتے ہوئے مفکرِ پاکستان علامہ سر محمد اقبالؒ کی تجویز کے مطابق قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا دستوری فیصلہ صادر کیا، جس کی مناسبت سے تحفظِ ختمِ نبوت کے محاذ پر محنت کرنے والی جماعتیں، جو کم و بیش سبھی مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتی ہیں، اس فیصلہ اور تحریک کی یاد کو تازہ کرنے اور بیداری کو قائم رکھنے کے لیے مختلف سطحوں پر تقریبات کا اہتمام کرتی ہیں، جس میں عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت، مجلسِ احرارِ اسلام اور انٹرنیشنل ختمِ نبوت موومنٹ بطور خاص پیش پیش ہوتی ہیں۔

ایک محاذ ملک کی جغرافیائی سرحدوں کے دفاع کا ہے جبکہ دوسرا محاذ وطنِ عزیز کی نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کا ہے۔ اور چونکہ اس وقت جغرافیائی اور نظریاتی دونوں محاذوں پر ملک و قوم کو علاقائی اور بین الاقوامی یلغار کا سامنا ہے اس لیے دونوں کی ضرورت و اہمیت کی طرف قوم کو متوجہ کرنا اور بیدار رکھنا وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

قادیانی مسئلہ کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ اب سے کم و بیش ایک صدی قبل جب ملک پر برطانوی استعمار کی حکومت تھی مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور کے قصبہ قادیان میں ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے مہدی اور مسیح ہونے کا اور پھر نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا، اور اپنی فلسفیانہ تحریرات کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا۔

مسلمانوں کا چودہ سو برس سے یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں جن کے بعد وحی اور نبوت و رسالت کا باب بند ہو چکا ہے۔ اس لیے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب تک جن لوگوں نے نبوت و رسالت کا دعویٰ کیا ہے یا آئندہ کریں گے وہ سب جھوٹے اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کے عقائد میں یہ بھی شامل ہے کہ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے سیدنا حضرت عیسٰی علیہ السلام آسمانوں پر زندہ اٹھا لیے گئے تھے۔ وہ قیامت سے پہلے نازل ہوں گے اور دنیا پر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا غلبہ قائم کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں فوت ہوں گے۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک میں ان کی تدفین ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی صحیح احادیث میں موجود ہے کہ جب حضرت عیسٰی علیہ السلام نازل ہوں گے تو ان سے پہلے مسلمانوں میں امام مہدیؒ کا ظہور ہو چکا ہوگا۔ ان کا نام محمد ہوگا، ان کی والدہ محترمہ کا نام آمنہ اور والد گرامی کا نام عبداللہ ہوگا۔ اور وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہوں گے۔ یہ دونوں بزرگ یعنی امام مہدیؒ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام مل کر امتِ مسلمہ کی قیادت کریں گے اور اسلامی خلافت کا احیا کریں گے۔

مسلمانوں کے ان عقائد کے ماحول میں مرزا غلام احمد قادیانی کا یہ دعویٰ کہ (نعوذ باللہ) وہ نبی اور رسول ہیں، وہی حضرت عیسٰی ہیں، اور امام مہدی کا مصداق بھی انہی کی شخصیت ہے، مسلمانوں کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول بلکہ قابلِ برداشت نہیں تھا۔ اس لیے تمام مکاتبِ فکر نے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا اور مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے پیروکاروں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینے کا اعلان کیا۔ مسلمانوں کے ان اجتماعی جذبات کی ترجمانی کرنے والوں میں اس وقت کے تمام اکابر شامل تھے جن میں حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ، حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، امیرِ شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، اور مفکرِ پاکستان علامہ سر محمد اقبالؒ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کو مسلمان اپنی صفوں میں شامل نہیں سمجھتے تو ان کا معاشرتی مقام اور حیثیت کیا ہوگی؟ یہ سوال اس وجہ سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اس وقت کے نبوت کے دعوے داروں مسیلمہ کذاب، طلیحہ اور سجاح کے ساتھ صحابہ کرامؓ نے جنگ کی تھی اور ان کے الگ وجود کو برداشت

نہیں کیا تھا۔ اس لیے اب کیا ہوگا اور قادیانیوں کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ اور طرزِ عمل کیا ہوگا اور کیا ہونا چاہیے؟ مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے یہ تجویز دی کہ اس وقت جنگ اور قتل و قتال کا ماحول نہیں ہے اور نہ ہی جدید سوسائٹی اس کی متحمل ہو سکتی ہے، اس لیے قادیانیوں کو دوسری غیر مسلم اقلیتوں کی طرح ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر معاشرے کا حصہ تسلیم کر لیا جائے اور انہیں اس حیثیت سے جان و مال کے تحفظ کے ساتھ وہ تمام حقوق دے دیے جائیں جو غیر مسلم اقلیتوں کو حاصل ہوتے ہیں۔

چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد ملک کے تمام مذہبی مکاتبِ فکر نے علامہ محمد اقبالؒ کی اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ ملک کے دستور و قانون میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دے دیا جائے۔ اس پر ۱۹۵۳ء میں عوامی سطح پر تحریکِ ختمِ نبوت بپا ہوئی جس کے مطالبات میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس وقت ملک کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان کو برطرف کرنے کا مطالبہ بھی شامل کیا گیا، جو اپنی سرکاری حیثیت کو ملک میں اور بیرون ملک قادیانیت کے فروغ کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں اس وقت کی حکومت ختم ہوگئی اور چودھری ظفر اللہ خان وزارتِ خارجہ سے سبکدوش ہوگئے۔ مگر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ منظور نہ ہوا، حالانکہ اس کے لیے ملک بھر کے عوام نے شدید احتجاجی مظاہرے کیے تھے اور جان و مال کی قربانیاں دینے کے علاوہ ہزاروں علماء کرام اور کارکنوں نے جیل و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔

البتہ اس مطالبہ کی منظوری کے لیے تحریک مسلسل چلتی رہی تا آنکہ ۱۹۷۴ء میں ملک کی منتخب پارلیمنٹ نے طویل بحث و مباحثہ کے بعد اس مطالبہ کو منظور کر کے دستوری ترمیم کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دے دیا۔ اس موقع پر قادیانیوں کے دونوں گروہوں کے سربراہوں مرزا ناصر احمد اور مولوی صدر الدین کو پارلیمنٹ کے فلور پر مسلسل چودہ روز تک اپنے موقف کی وضاحت اور سوال و جواب کا موقع دیا گیا۔ اسمبلی میں موجود علماء کرام مولانا مفتی محمودؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا عبد المصطفیٰ ازہریؒ، مولانا محمد ذاکرؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، اور دیگر معزز ارکان کے علاوہ ملک کے اٹارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار مرحوم نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ طویل

بحث وتمحیص کے بعد جب پوری آسمبلی قادیانیوں کے مسلمان نہ ہونے پر مطمئن ہوگئی تو وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قیادت میں پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا متفقہ دستوری فیصلہ صادر کر دیا۔ جبکہ قومی سطح پر بحث ومباحثہ کے علاوہ عالم اسلام کے علمی ودینی مراکز سے بھی راہنمائی کے لیے رابطہ کیا گیا اور امتِ مسلمہ کی نمائندہ تنظیم رابطہ عالمِ اسلامی نے متفقہ طور پر قادیانیوں کے دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کی قرارداد منظور کر دی۔

مگر قادیانیوں نے دستور وقانون، منتخب پارلیمنٹ اور عالمِ اسلام کے اس متفقہ فیصلے کو مسترد کر دیا اور وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو غیر مسلم قرار دیتے ہوئے خود کو مسلمان کہلانے پر بضد ہوگئے۔ ان کے اس ردِعمل سے اس بحران نے ایک نئی شکل اختیار کر لی اور قادیانی گروہ نے ملتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ پاکستان کے خلاف بھی عالمی سطح پر مورچہ بندی کر کے پاکستان کے اسلامی نظریاتی تشخص کے مخالف بین الاقوامی حلقوں کے اور اپنے استعماری آقاؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ یہ گٹھ جوڑ اب تک قائم ہے اور پاکستان کے اسلامی تشخص اور دستورِ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کے خلاف بین الاقوامی سیکولر حلقوں کی مہم میں قادیانی گروہ ان کے شریکِ کار بلکہ آلۂ کار کے طور پر مسلسل سرگرمِ عمل ہے۔

اس کے ساتھ ہی قادیانیوں نے دستوری فیصلہ کو مسترد کرتے ہوئے پاکستان کے اندر اسلام کے نام اور مسلمانوں کے مذہبی شعائر واصطلاحات کا ناجائز استعمال جاری رکھا جس پر مسلمانوں کو شدید اعتراض تھا۔ اور یہ بات دستور وقانون کی بھی صریح خلاف ورزی تھی، اس لیے ۱۹۸۴ء میں ایک بار پھر عوامی سطح پر تحریکِ ختمِ نبوت منظم ہوئی جس کی قیادت حضرت خواجہ خان محمدؒ، مولانا حافظ عبدالقادر روپڑیؒ، مولانا مفتی مختار احمد نعیمیؒ، علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ، مولانا تاج محمودؒ، مولانا محمد شریف جالندھریؒ، اور علامہ علی غضنفر کرارویؒ شامل تھے۔ چنانچہ عوامی احتجاج اور تحریک کی وجہ سے ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعہ قادیانیوں کو اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے اور مسلمانوں کی مذہبی اصطلاحات اور شعائر کے استعمال سے قانونی طور پر منع کر دیا گیا۔ یہ صدارتی آرڈیننس صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ملک کے تمام دینی حلقوں کے متفقہ مطالبے پر نافذ کیا تھا، جبکہ بعد میں عام انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی پارلیمنٹ نے اس کی توثیق کر کے اسے دستوری اور جمہوری

حیثیت بھی دے دی۔

اس وقت سے قادیانیوں کی مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف محاذ آرائی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جاری ہے۔ وہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان دشمن سیکولر حلقوں کے ساتھ مل کر اسلام، ملتِ اسلامیہ اور وطنِ عزیز کے خلاف لابنگ اور پروپیگنڈے کی مہم جاری رکھے ہوئے ہیں، اور ملک کی اسلامی نظریاتی شناخت کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اس لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو جہاں قومی خود مختاری کی بحالی، ملکی معاملات میں بین الاقوامی مداخلت سے نجات، اور علاقائی سطح پر ملکی سرحدات کے تحفظ کے چیلنجز درپیش ہیں، وہاں ان مطالبات کا بھی سامنا ہے کہ

- دستورِ پاکستان کی نظریاتی اساس "قراردادِ مقاصد" کو ختم کر دیا جائے۔
- دستور کی اسلامی دفعات کو تبدیل کر کے ملک کو سیکولر ریاست بنایا جائے۔
- تحفظِ ختمِ نبوت سے متعلقہ دستوری اور قانونی شقوں کو ختم کر کے قادیانیوں کو ملک کے اندر اور باہر اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔
- تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے قانون کو ختم کر دیا جائے۔
- ملک میں قرآن وسنت کے جو چند قوانین رسمی اور علامتی طور پر نافذ ہیں انہیں بھی منسوخ یا تبدیل کر دیا جائے۔
- اور قرآن وسنت کے حوالہ سے قانون سازی کو قطعی طور پر شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا جائے۔

اس مہم میں ملکی اور بین الاقوامی سیکولر حلقوں کے ساتھ قادیانی گروہ بھی پوری طرح شریک اور سرگرم ہے۔ اس لیے تحفظِ ختمِ نبوت کے حوالہ سے کی جانے والی جدوجہد ملک کی اسلامی شناخت کے تحفظ اور مسلمانوں کے عقائد وایمان کے دفاع کے ساتھ ساتھ ملک وقوم اور دین وملت کے خلاف عالمی نظریاتی وثقافتی یلغار کی روک تھام کے لیے بھی انتہائی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں کام کرنے والی تمام جماعتیں اور حلقے خواہ وہ کسی بھی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، پوری امت کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کر رہے ہیں۔ اور قرآن وسنت کی جامع تعلیمات پر یقین رکھنے والے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس جدوجہد میں شریک ہو، اور جو کردار بھی وہ کسی دائرہ میں یا کسی سطح پر ادا کر سکتا ہے اس سے گریز نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

مذاہب کا تسلسل اور ختمِ نبوت

(اپریل ۲۰۱۶ء کے دوران یوٹیوب چینل ''میسج ٹی وی'' پر گفتگو)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ چند سال پہلے کیپ ٹاؤن جنوبی افریقہ میں ایک ختمِ نبوت کانفرنس کے دوران میں نے قادیانیت کے حوالے سے ایک پہلو پر گفتگو کی گئی تھی جو الحمد للہ پسند کی گئی اور دنیا بھر میں اسے وسیع پیمانے پر پھیلایا گیا اور سنا گیا۔ اس پر قادیانی حضرات کی طرف سے ایک اعتراض سامنے آیا ہے اور وہ بھی دنیا بھر میں پھیلایا گیا ہے۔ میں آج اس حوالے سے تھوڑی سی گفتگو کرنا چاہوں گا۔

میں نے یہ گزارش کی تھی کہ قدرت کا قانون یہ ہے اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کا تسلسل یہ بتاتا ہے کہ نئے نبی کے آنے سے مذہب بدل جاتا ہے۔ چونکہ نبی وہ واحد شخصیت ہوتی ہے جس کی بات کسی دلیل کے بغیر ماننا ضروری ہوتی ہے، نبی جو کہتا ہے وہ دلیل ہوتی ہے، نبی مطلقاً مطاع ہوتا ہے، تو نبی کے بدلنے سے اطاعت کا مرکز تبدیل ہو جاتا ہے۔

بنیادی طور پر یہ بات علامہ محمد اقبالؒ نے کہی تھی، تو میں نے ان کی اس بات کو بنیاد بنایا تھا کہ قادیانی چونکہ نئی نبوت کی بات کرتے ہیں تو ان کا مذہب ہمارے مذہب سے الگ ہے، وہ اپنے مذہب کا نیا نام رکھیں۔ جس طرح یہودیت سے عیسائیت الگ ہوئی، نئے نبی، نئی وحی اور نئی کتاب کی بنیاد پر۔ اور جس طرح عیسائیت سے ہم مسلمان الگ ہیں، نئے نبی، نئی وحی اور نئی کتاب کی بنیاد پر۔ ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کو مانتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو بھی مانتے ہیں، لیکن چونکہ ہم ان کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن کریم پر بھی ایمان رکھتے ہیں اس لیے ہمارا مذہب ان سے الگ ہے، جیسے کہ عیسائیوں کا یہودیوں سے الگ ہے۔ یہ میں نے بنیادی بات کی تھی، غلط یا صحیح اپنے مقام پر لیکن مذہب بہر حال تبدیل ہو جاتا ہے کہ اطاعت کا مرکز تبدیل ہو جاتا ہے۔

اس پر قادیانی حضرات کی طرف سے یہ اعتراض و استدلال کچھ عرصہ پہلے سامنے آیا ہے اور دنیا بھر میں اس کو دوہرایا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کر کے سیدھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چلے گئے ہیں، یہ درمیان میں جو انبیاء کرامؑ آئے تھے ان کے

آنے سے تو مذہب نہیں بدلا تھا، ان کا ذکر مولوی صاحب نے کیوں نہیں کیا؟ بادی النظر میں یہ اعتراض سمجھ میں آتا ہے۔ اصل میں یہ اعتراض اس لیے پیدا ہوا کہ میری گفتگو میں کچھ اجمال رہ گیا تھا، میں نے پوری وضاحت نہیں کی تھی، میں معترضین کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے یہ سوال پیدا کر کے مجھے اپنی گفتگو کا اجمال دور کرنے کا موقع دیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ تک درمیان میں سینکڑوں نہیں، بعض روایات کے مطابق ہزاروں پیغمبر آئے ہیں، ان کے آنے سے مذہب نہیں بدلا، مذہب بدلا حضرت عیسیٰؑ کے آنے پر آخری مرحلے میں۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

۱. ایک تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰؑ تک نبیوں کا آنا جاری تھا اور ختمِ نبوت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کو بھی خاتم الانبیاء کہا جاتا ہے لیکن بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر۔ چونکہ اس سے پہلے بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ جاری تھا اور ختمِ نبوت کا عقیدہ نہیں تھا اس لیے انبیاء کرامؑ کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

۲. دوسری وجہ یہ بنی کہ حضرت موسیٰؑ سے شروع ہو کر حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ تک جس نبی نے بھی اس دائرے میں نبوت کی بات کی اسے تسلیم کیا گیا، لیکن جب حضرت عیسیٰؑ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو بنی اسرائیل کے یہود نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی بنیاد پر دونوں کے مذہب الگ ہو گئے۔ حضرت عیسیٰؑ کا انکار کرنے والے پہلے مذہب کے ماننے والے رہے، اور انہیں تسلیم کرنے والے نئے مذہب کے پیروکار بن گئے۔

ہمارے ہاں ایک تو یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر یہ اعلان فرما دیا تھا کہ میں آخری نبی ہوں "لا رسالة بعدی ولا نبوة" میرے بعد نہ کسی کو رسالت ملے گی اور نہ نبوت ملے گی۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ بنی اسرائیل کی طرز والی نبوت جسے قادیانی حضرات "امتی نبی" کہہ کر اپنا دعویٰ منوانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ صورت حضورؐ کے زمانے میں پیدا ہوئی تو آپؐ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

مسیلمہ کذاب کے بارے میں روایات اٹھا کر دیکھ لیں، وہ حضورؐ کے مقابلے پر مستقل نبوت کا نہیں بلکہ امتی نبی ہونے کا دعویدار تھا۔ وہ جناب نبی کریمؐ کا کلمہ خود بھی پڑھتا تھا اور لوگوں سے بھی

پڑھواتا تھا، یہ اقرار کروا کے پھر اپنی بات کرتا تھا کہ وہ رسول ہیں اور میں بھی رسول ہوں۔ یہی امتی نبی کا تصور ہے۔ وہ "لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ" اور پھر "لاالہ الااللہ مسیلمہ رسول اللہ" پڑھواتا تھا۔ نبی اکرمؐ کو رسول ماننے کے بعد امتی اور تابع نبی کے طور پر اپنی بات کرتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ ان کی اذان بھی یہی تھی۔ ختمِ نبوت کے پہلے شہید حبیب بن زیدؓ جو مسیلمہ کے ہاتھوں قتل ہوئے، اسی وجہ پر قتل ہوئے۔ اس نے پہلے حبیب بن زیدؓ سے پوچھا "اتشھد ان محمدًا رسول اللہ؟" انہوں نے کہا کہ "اشھد ان محمدًا رسول اللہ"۔ پھر پوچھا کہ "اتشھد انی رسول اللہ؟" انہوں نے کہا کہ نہیں۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جو دو نمائندے مسیلمہ کذاب کا خط لے کر جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، رسول اللہ نے ان سے بھی اسی ترتیب سے پوچھا "اتشھدان انی رسول اللہ؟" کیا تم مجھے خدا کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا جی "نشھد" آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر پوچھا "اتشھدان ان مسیلمۃ رسول اللہ؟" کیا تم یہ بھی گواہی دیتے ہو کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ انہوں نے کہا ہم اس کی بھی گواہی دیتے ہیں۔

مسیلمہ کذاب کا دعویٰ جناب نبی کریمؐ کے امتی نبی ہونے کا دعویٰ تھا۔ اس پر اس کا جو خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہے، بخاری شریف میں موجود ہے، اس کا عنوان بھی یہی ہے "من مسیلمۃ رسول اللہ الیٰ محمد رسول اللہ" کہ مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کے نام۔ اور آگے جو پیشکش کی ہے یہ زیادہ توجہ طلب بات ہے۔ اس نے جناب نبی کریمؐ کو صلح کی پیشکش کی کہ مجھے کسی درجہ میں تسلیم کر لیا جائے تو میرے پاس فارمولا ہے۔ آپ اپنے بعد مجھے خلیفہ نامزد کر دیں، اور اگر یہ بات آپ کو منظور نہیں ہے تو پھر تقسیم کر لیں "لنا وبر و لک مدر" شہروں کے نبی آپ اور دیہات کا نبی میں۔ یہ کھلے شواہد ہیں کہ مسیلمہ کذاب امتی نبی ہونے کا دعویدار تھا۔ امتی نبی ہونے کا تصور بنی اسرائیل میں تھا، لیکن ہمارے ہاں امتی نبی ہونے کے تصور کی حضورؐ نے مسیلمہ کذاب کو رد کرتے ہوئے صراحتًا نفی فرما دی کہ نہ کوئی امتی نبی اور نہ غیر امتی۔

مسیلمہ کذاب خود مدینہ منورہ آیا، جناب نبی کریمؐ کے ساتھ دوبدو گفتگو کی۔ بخاری شریف کی روایت میں وہ مکالمہ موجود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشکش کے جواب میں دو باتیں فرمائیں۔ ایک بات تو اصولی تھی، قرآن کریم کی آیت پڑھی "ان الارض للہ یورثھا من یشآء من

عبادہ" (الاعراف ۱۲۸) کہ زمین اللہ کی ہے، خلیفہ کسے بنانا ہے، شہر کسے دینے ہیں، دیہات کسے دینے ہیں، وہ اللہ کا کام ہے میرا کام نہیں ہے۔ اور دوسرا جواب عملی تھا، مسیلمہ سے اس ملاقات میں حضورؐ نے زمین سے ایک لکڑی اٹھائی، فرمایا تم مجھ سے خلافت اور زمین کی تقسیم کی بات کرتے ہو، مجھ سے اگر یہ لکڑی مانگو گے، میں دینے کا روادار نہیں ہوں۔ میں نے گزارش کی ہے کہ

- ختمِ نبوت کا تصور بنی اسرائیل میں نہیں تھا لیکن ہمارے ہاں ہے،
- امتی نبی ہونے کا تصور بنی اسرائیل میں تھا لیکن ہماری امت میں نہیں ہے۔

یہ دو باتیں بالکل واضح طور پر ہمارے ذہنوں میں رہنی چاہئیں۔ دونوں باتوں کی نفی کرنے والے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہیں، اپنے قول کے ساتھ بھی اور اپنے عمل کے ساتھ بھی۔ بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰؑ سے پہلے جب انکار نہیں کیا گیا کیونکہ ختمِ نبوت کا عقیدہ نہیں تھا تو مذہب ایک ہی رہا۔ لیکن جب حضرت عیسیٰؑ کا انکار کر دیا گیا تو انکار کرنے والوں کا مذہب اور ہو گیا اور اقرار کرنے والوں کا مذہب اور ہو گیا۔ یہ تقسیم کی بنیاد تھی۔

ہمارے ہاں تو شروع سے یہ معاملہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور حضورؐ کے بعد چودہ سو سال تک جس شخص نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے، خواہ کسی حیثیت سے کیا ہے، امت نے اسے قبول نہیں کیا۔ بنی اسرائیل قبول کرتے رہے کہ ختم نبوت کا عقیدہ نہیں تھا۔ ہمارے ہاں امت نے مسیلمہ کذاب سے لے کر مرزا غلام احمد تک کسی کو قبول نہیں کیا کہ ہمارے ہاں ختمِ نبوت کا عقیدہ ہے۔ جب مرزا غلام احمد کا انکار کر دیا گیا، پوری امت نے انکار کر دیا، امت کے اندر کوئی حلقہ ایسا نہیں ہے جو قادیانیوں کے دعوے کو تسلیم کرتا ہو اور امتی نبی کے تصور کو تسلیم کرتا ہو، تو صحیح یا غلط کی بحث سے قطع نظر اُن کا مذہب ہم سے الگ ہو گیا۔ انکار کرنے والوں کا مذہب اسلام رہا، اور ماننے والوں کا مذہب نیا ہے۔

قادیانیوں سے ہمارا یہی سوال ہے کہ جب مذہب نیا ہے تو اس کا عنوان، اس کی اصطلاحات، اس کے شعائر، یہ مسلمانوں والے کیوں ہیں؟ اصل جھگڑا قادیانیوں سے یہ ہے کہ مذہب ہم سے الگ ہے تو علامات و شعائر ہمارے کیوں استعمال کر رہے ہیں؟ کلمہ طیبہ، کعبہ، بیت اللہ، امیر المومنین، ام المومنین، مسجد، مینار، یہ ہماری مسلّمہ علامتیں ہیں۔ ہمارا جھگڑا یہ ہے ہماری شناخت استعمال نہ کریں۔

میں اس کی یہ مثال ایک بار پھر دہراؤں گا کہ پہلی کمپنی سے الگ ہو کر نئی کمپنی بنتی ہے، غلط صحیح سے قطع نظر، لیکن نئی کمپنی نیا نام، نیا ٹریڈمارک، نیا مونوگرام اور نئی علامات اختیار کرے گی۔ اگر پہلی کمپنی سے جدا ہو کر نئی بننے والی کمپنی نام، مونو اور ٹریڈمارک پہلی کمپنی کا استعمال کرے گی تو یہ عمل فراڈ اور دھوکہ کہلاتا ہے۔ اسی دھوکے کو واضح کرنے کے لیے ہم دنیا کے سامنے یہ موقف واضح کرتے رہتے ہیں۔

یہ اعتراض قادیانیوں کی طرف سے آیا تھا تو میں نے ضروری سمجھا کہ اس کا جواب دے دیا جائے، چنانچہ آج میں نے اپنی گفتگو سے قادیانیوں کے اس مغالطے کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ قادیانیوں کو ہدایت دے، میں ان کے لیے ہدایت کا دعاگو رہتا ہوں، اللہ تعالیٰ انہیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں قادیانی حضرات کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتا رہتا ہوں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چار آدمیوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ مسیلمہ، اسود عنسی، طلیحہ، اور سجاح نے۔

۱. اسود عنسی حضورؐ کے زمانے میں مقابلے پر آیا اور قتل ہو گیا۔
۲. مسیلمہ حضورؐ کے زمانے میں مقابلے پر نہیں آیا، بعد میں آیا اور قتل ہوا۔
۳. طلیحہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، مسلمانوں سے دو جنگیں لڑی تھیں اور حضرت عکاشہؓ جیسے صحابی کو شہید کیا تھا۔ جبکہ بعد میں طلیحہ نے توبہ کر کے اسلام قبول کیا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں قادسیہ کی جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ محدثین کرام ان کا شمار صحابہ میں کرتے ہیں، حضرت طلیحہ بن خویلد اسدیؓ۔
۴. سجاح نے بھی توبہ کر لی تھی۔ وہ نبوت کی دعویدار تھی، فوجیں لے کر مقابلے پر آئی تھی لیکن شکست کے بعد روپوش ہو گئی تھی۔ پھر حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں آئی، توبہ کی، اسلام قبول کیا، حضرت معاویہؓ کے حکم پر کوفہ میں آباد ہوئی، وہیں ایک عابدہ زاہدہ خاتون کے طور پر رہی۔ جب فوت ہوئی تو حضرت سمرہ بن جندبؓ کوفہ کے گورنر تھے انہوں نے جنازہ پڑھایا اور تدفین کی، اس طرح سجاحؒ ہماری صالحہ خواتین میں شمار ہوتی ہے۔

میں قادیانیوں سے یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ کیا مسیلمہ اور اسود کے نقشِ قدم پر چلنا ضروری ہے؟ طلیحہؓ اور سجاحؒ کا نقش قدم بھی سامنے ہے۔ میں پھر دعوت دوں گا کہ تھوڑا سا زاویۂ نگاہ بدلیں، طلیحہؓ اور سجاحؒ پر بھی غور کر لیں، واپسی کا راستہ کھلا ہے، واپس آئیں، آپ ہمارے بھائی ہوں گے، ہم سینے سے

لگائیں گے۔ مغالطے سے نکلیں، امت پر زبردستی مسلط ہونے کی بجائے امت کا حصہ بنیں، ہم آپ کو قبول کریں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

یہودیوں اور قادیانیوں میں مماثلت

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳دسمبر ۲۰۱۶ء)

......علامہ محمد اقبالؒ نے قادیانیوں کے بارے میں کہا تھا کہ وہ مسلم معاشرہ میں یہودیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جبکہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے بھی یہ کہہ کر اس کی تائید کی تھی کہ قادیانی گروہ پاکستان میں وہ مقام حاصل کرنا چاہتا ہے جو یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہے کہ ملک کی تمام پالیسیوں پر ان کا کنٹرول ہو۔ اس حوالہ سے قادیانیوں کا طریق کار اس قدر پیچیدہ اور دجل آمیز ہوتا ہے کہ اسے بروقت سمجھنا اور اس جال سے نکلنا بسا اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے، اور وہ اہم کلیدی اسامیوں تک رسائی حاصل کر کے ان کے ذریعہ اپنا کام صفائی کے ساتھ کر جاتے ہیں۔ یہی یہودیوں کا طریقِ واردات ہے کہ اعلیٰ ترین مناصب تک پوری قابلیت، صلاحیت اور مہارت کے ساتھ رسائی حاصل کرتے ہیں اور اپنے منصبی فرائض کو بہترین طور پر سرانجام دیتے ہیں لیکن اس کی آڑ میں اپنا کام کر جاتے ہیں۔ قادیانیوں کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا مذکورہ بالا تبصرہ بلاوجہ نہیں ہے۔

......

قادیانیوں کے ساتھ تعلقات کا سماجی دائرہ

(۲۰۱۷ء کے دوران الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ میں
ایک نشست سے گفتگو کا ایک حصہ)

......سماجی دائرہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اسے بہت پیروکار ملے۔ جماعت احمدیہ کا پھیلاؤ ہوا۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وہ ہمارے درمیان رہتے ہیں، حکومت ہماری نہیں ہے، مسلم حکومت ہوتی تو معاملات نمٹ چکے ہوتے۔ یہ مسئلہ کیوں پیدا ہوا، یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ جب پیدا ہوا حکومت غیر مسلموں (انگریزوں) کی تھی، فیصلہ کرنے والی اتھارٹی غیر مسلم تھی۔ ہم غیر مسلموں کے تحت تھے، اب قادیانیوں کے ساتھ معاشرتی برتاؤ کیا ہوگا؟ یہ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ہمارے غلبے کے دور کے مسائل کی نوعیت اور ہے اور مغلوبیت کے دور کے مسائل کی نوعیت اور ہوتی ہے۔ بہت سے مسائل میں ہمیں اس وجہ سے نیا رخ اختیار کرنا پڑا۔ جبکہ ہماری فقہ کی ترتیب و تدوین غلبے کے دور کی ہے جہاں ہمارا اپنا معاشرہ ہو، ہماری حکومت اور ہمارا نظام ہو۔ مگر پچھلے دو تین سو سال میں ہمیں یہ بھی پیش آیا کہ ہم مغلوب ہو گئے، بحیثیت قوم غلام ہو گئے، حالات متغیّر ہو گئے۔ اب یہ نئی بات تھی کہ غیر مسلموں کے غلبے میں ان کے ماتحت وقت گزاریں گے تو کیسے؟ اس کے نئے تقاضے پیدا ہو گئے، اس سے بیسیوں مسائل پیدا ہوئے۔

مثلاً ایک مسئلہ یہ کہ احناف کے ہاں جمعہ کے انعقاد کی شرائط میں "سلطان او نائبہ" شرط ہے۔ اب سلطان تو ختم ہو گیا، غیر مسلم سلطان بن گئے، اب کیا کریں؟ بعض حضرات نے جمعہ ساقط کر دیا کہ اب جمعہ فرض ہی نہیں ہے، جمعہ کی جگہ ظہر پڑھنے کا حکم دیا۔ لیکن پورے برصغیر میں جمعہ مستقل معطل کر دینا امت کے اجتماعی مفاد کے خلاف تھا۔ اس وجہ سے ہم نے مسلم سلطان کے آنے تک اس شرط میں تبدیلی کی اور مسجد کے نمازیوں کی اجتماعی رائے کو "سلطان او نائبہ" کا قائم مقام قرار دیا۔ جس کے امام اور خطیب ہونے پر نمازی متفق ہوں وہی سلطان کا نائب ہے۔ اس سے یہ شرط پوری ہو جاتی ہے اور

جمعہ کو تعطل کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اسی حوالے سے ہمارے بعض مفتیان کرام کا فتویٰ چلا آرہا ہے اور عمل بھی ہوتا ہے کہ چونکہ ہم ایک بڑی شرط کے بغیر مجبوری کے تحت جمعہ پڑھ رہے ہیں اس لیے جمعہ بھی پڑھا جائے اور ظہر احتیاطی بھی پڑھی جائے۔ ظہر احتیاطی کا بھی پس منظر ہے۔ مولانا احمد رضا خانؒ کا فتویٰ یہی ہے۔ غلبے کے دور میں نوعیت اور تھی اور مغلوبیت کے دور میں نوعیت اور تھی۔

بالکل یہی صورتحال ہمیں قادیانیت کے حوالے سے پیش آئی، غلبے کے دور میں مدعیانِ نبوت اور ان کے پیروکاروں سے نمٹنا حکومت کا کام تھا لیکن مغلوبیت کے دور میں کس نے کیا کرنا تھا اور اب معاملہ کیا ہوگا؟ اس پر علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز یہ تھی اور انہوں نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ قادیانی ہمارے ساتھ معاشرے میں رہیں لیکن انہیں ہمارے ساتھ شمار نہ کیا جائے، ان کو غیر مسلم گروہ کے طور پر ڈیل کیا جائے۔ یہ بات سب سے پہلے علامہ محمد اقبالؒ نے کہی تھی کہ ان کے عقائد ہمارے عقائد سے مختلف ہیں جن کی وجہ سے یہ مسلمان نہیں ہیں، اگرچہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ اس لیے ان کو غیر مسلم اقلیت کے طور پر ڈیل کیا جائے۔

جب اقبالؒ نے یہ کہا کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں تو اس پر اقبال کا پنڈت جواہر لال نہرو سے مکالمہ بھی ہوا۔ نہرو نے کہا، قادیانی کلمہ پڑھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، کعبے کو مانتے ہیں، قرآن بھی پڑھتے ہیں، پھر مسلمان کیوں نہیں ہیں؟ انگلش مکالمہ تھا، اب اردو میں چھپ گیا ہے۔ قادیانیت کو آج کے سماجی تناظر میں سمجھنے کے لیے سب سے بہتر مکالمہ ان دونوں کا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات سے میں کہا کرتا ہوں کہ اگر ہماری باتیں آپ کو سمجھ نہیں آرہیں تو اقبالؒ کو پڑھ لو۔ اقبالؒ آپ کو سمجھا دے گا کہ قادیانی مسلمان کیوں نہیں ہیں۔

لیکن جب پاکستان بنا تو اس کی نوعیت پھر بدل گئی، اب سابقہ پوزیشن (مسلم حکومتوں والی) پر واپس جانا ہے یا اس پوزیشن (انگریز کے دور والی) پر رہنا ہے؟ ۱۹۵۳ء میں تمام مکاتبِ فکر کے اکابر علماء کرام نے ایک اجماعی اور اجتہادی فیصلہ کیا۔ میں اسے پاکستان کے علماء کا بڑا اجماعی اور اجتہادی فیصلہ کہا کرتا ہوں۔ انہوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ چنانچہ طویل تحریک کے بعد ۱۹۷۴ء میں دستور میں یہ فیصلہ ہوا اور اس وقت سے قادیانی غیر مسلم اقلیت کے طور پر چلے آرہے ہیں۔

آج میں نے قادیانیت کے حوالے سے دو دائرے ذکر کیے ہیں: پہلا اعتقادی دائرہ جس میں مناظرے کا میدان اور مباہلہ کا میدان ہے، اور دوسرا سماجی دائرہ جس میں اقبالؒ کی تجویز، اقبال اور نہرو کا مکالمہ، اور پاکستان کے علماء کا اجماعی فیصلہ ہے۔

مرتد کی سزا کی بحث اور قادیانیت

(۲۰۱۷ء کے دوران الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ میں ”نفاذِ شریعت“
کے عنوان پر سلسلۂ محاضرات کی ایک نشست سے خطاب کا کچھ حصہ)

......اس پر ہمارے ہاں یہ بحث چھڑ گئی کہ مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں ہے؟ یہ بڑی لمبی بحث ہے۔ ہمارے متجددین میں سے بہت سے لوگ اس کو حد نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ لوگوں کو قتل کروایا تھا وہ سیاستاً حکمتِ عملی کے تحت تھا، قانوناً نہیں تھا۔ اس وقت مرزا غلام احمد کے بعد قادیانی دو حصوں میں تقسیم تھے، لاہوری اور قادیانی۔ لاہوریوں کا امیر مولوی محمد علی تھا جو کہ بہت فاضل آدمی تھا، لیکن اللہ کی قدرت ہے، ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہ علمی اور فکری دنیا میں بہت بڑا آدمی تھا اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس نے اس بحث کو شروع کیا کہ امیر حبیب اللہ خان نے یہ غلط کیا ہے، اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے، یہ حد نہیں ہے بلکہ تعزیر ہے جس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس زمانے میں ”الشہاب“ کے نام سے دیا۔ رسالہ الشہاب مختصر سا تھا لیکن بہت جامع تھا۔ اس میں انہوں نے قرآن وسنت اور اجماعِ امت سے یہ ثابت کیا کہ اسلام میں ارتداد کی متعیّن سزا قتل ہی ہے اور یہ حد ہے، سیاست یا تعزیر نہیں ہے۔ "من ارتد فاقتلوہ"۔ ایک علمی بحث ہے، بہرحال یہ رسالہ انگریز نے ضبط کر لیا۔ یہ دو بڑے متکلّم تھے جن کا آپس میں مکالمہ ہوا۔

اب یہ بات بھی ہماری پھنس گئی۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو قتل کر کے آج کی دنیا میں ایک ریاست کیسے اپنا آغاز کرے گی۔ قادیانی لاکھوں کی تعداد میں تھے، اب بھی ہیں۔ کیا لاکھوں آدمیوں کا قتلِ عام ہو گا؟ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس کا ایک حل علامہ اقبالؒ تجویز کر چکے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے قادیانیوں کو غیر مسلم، غدار اور یہودیت کا چربہ قرار دیا تھا۔ قادیانیت پر علامہ اقبالؒ نے بہت کام کیا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ آج کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو ان کی نفسیات کے مطابق اگر قادیانیت سمجھانی ہے تو اقبالؒ سے بہتر کوئی نہیں۔ یہ لوگ علماء کی اصطلاحات کو

نہیں سمجھتے۔ آج کی سوشل اصطلاحات اور آج کے سماجی مسائل میں آج کے پڑھے لکھے لوگوں کو اگر قادیانیت سمجھانی ہے تو اس کے لیے اقبالؒ سے بہتر کوئی ہمارا نمائندہ نہیں ہے۔

علامہ اقبالؒ قادیانی ہوتے ہوتے بچے تھے اور واقف حضرات کا کہنا یہ ہے کہ انہیں بچانے والا مولوی انور شاہؒ ہے۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر قادیانیوں نے کشمیر پر اپنا تسلط جمانے کی پلاننگ کی۔ کشمیر کے راجہ اور عوام کے درمیان تنازع کے ماحول میں کشمیر کمیٹی بنوائی۔ اس کمیٹی کے سربراہ علامہ اقبالؒ تھے۔ اس پر مسلمان علماء متوجہ ہوئے۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ اور دوسرے علماء نے اقبالؒ سے کہا ارے خدا کے بندے! کیا کرنے لگے ہو؟ انہوں نے کہا مجھے کچھ اشکالات ہیں۔ وہ اشکالات علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کی ملاقات سے دور ہوئے تو اقبال نے قادیانیوں کی کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دیا اور قادیانیوں کے خلاف خود مورچہ لگا کر بیٹھ گئے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اسلام سے قادیانیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پر علامہ اقبالؒ کا پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ مکالمہ ہوا جو کہ بڑا زبردست مکالمہ ہے۔ نہرو اقبال خط وکتابت چھپی ہوئی ہے۔ اصل انگریزی میں ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی چھپا ہوا ہے۔ نہرو قادیانیوں کے حق میں بات کر رہا تھا، اس کا کہنا تھا کہ جب قادیانی کلمہ پڑھتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، حضرت محمد کو اللہ کا رسول مانتے ہیں، کعبہ بھی یہی مانتے ہیں، تو پھر یہ مسلمان کیوں نہیں ہیں؟ اس نے اقبالؒ سے کہا کہ تم بڑے تنگ نظر ہو گئے ہو۔ وہی جو آج کی دنیا کا سوال ہوتا ہے۔ ہم لوگ اقبالؒ کو صرف شعروں کے حوالے سے جانتے ہیں، ہمیں اقبالؒ کو ایک مفکر کے طور پر پڑھنا چاہیے۔

علامہ اقبالؒ نے اس وقت انگریز حکومت کے سامنے تجویز رکھی کہ قادیانی غیر مسلم ہیں، ان کو مسلمان سوسائٹی کا حصہ سمجھنے کی بجائے غیر مسلم قوموں کے ساتھ شمار کیا جائے۔ اقبالؒ نے حل دیا کہ قادیانیوں کو ایک مسلمان ریاست (جو بعد میں بنی) میں قتل کرنا شاید حالات کے تقاضے کے مطابق ٹھیک نہ ہو، لیکن غیر مسلم اقلیت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ انہیں مسلمان تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اسلامی ریاست میں جیسے دوسری اقلیتیں ہیں عیسائی، سکھ، یہودی وغیرہ، جو ان کی حیثیت ہے وہی قادیانیوں کی حیثیت ہو گی۔

پاکستان بننے کے بعد یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ ایک اسلامی ریاست میں منکرینِ ختمِ نبوت کا معاشرتی

سٹیٹس کیا ہو گا؟ کیا یہ قتل کیے جائیں گے یا ملک میں رہیں گے؟ غلام بنیں گے یا قیدی رہیں گے؟ ان کی معاشرتی حیثیت کیا ہو گی؟ اس پر علماء کرام نے متفقہ اجتہاد کر کے علامہ اقبالؒ کی تجویز کو اجتماعی طور پر قبول کر لیا۔ تمام مکاتبِ فکر کے علماء جنہوں نے بائیس نکات طے کیے تھے، انہوں نے کہا ہم اقبالؒ کی اس تجویز کو قبول کرتے ہیں۔ پاکستان میں قادیانیوں کو زندہ رہنے اور بسنے کا حق ہے، لیکن مسلمان کے طور پر نہیں، بلکہ غیر مسلم اقلیت کے طور پر انہیں پاکستان کا شہری تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ملک میں قادیانیت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تو ۱۹۵۲ء میں علماء کرام اکٹھے ہوئے۔......

علامہ محمد اقبالؒ کا پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب

(۵نومبر۲۰۱۷ءکومجلسِ احرارِ اسلام پاکستان کے مرکزی دفتر لاہور میں
منعقدہ ختمِ نبوت تربیتی کورس کی اختتامی نشست سے خطاب کا ایک حصہ)

......اس کے بعد مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے یومِ پیدائش ۹ نومبر کی مناسبت سے اس مسئلہ میں ان کا حصہ شامل کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام علامہ محمد اقبالؒ کا ایک تاریخی خط اس کالم میں شامل کیا جا رہا ہے۔ آج کے عالمی اداروں اور سیکولر لابیوں کی طرح پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس مغالطہ کا شکار تھے کہ جب قادیانی حضرات قرآن کریم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں تو انہیں غیر مسلم کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ ان کا یہ مغالطہ دور کرنے کے لیے علامہ محمد اقبالؒ نے ان سے خط و کتابت کی تھی جو انگلش اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں سے علامہ محمد اقبالؒ کا ایک خط ان کے یومِ پیدائش پر انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے:

''ڈیئر پنڈت جواہر لال!

کل آپ کا مرسلہ خط ملا جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں نے جب آپ کے تحریر کردہ مضامین کا جواب لکھا تو میرا گمان تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویہ کا علم نہیں۔ میرے ان جوابات کے لکھنے کی بنیادی وجہ فی الحقیقت اس بات کا ظاہر کرنا اور خاص طور سے آپ پر یہ واضح کرنا تھا کہ مسلمانوں کے اندر (انگریز حکومت سے) جذبات وفاداری کیسے پیدا ہوئے اور یہ کہ احمدیت نے ان کے لیے الہامی بنیاد کس طرح فراہم کی۔

ان مضامین کی اشاعت کے بعد میرے لیے یہ انکشاف انتہائی حیران کن تھا کہ خود مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ بھی ان تاریخی وجوہات سے ناواقف ہے جنہوں نے احمدی تعلیمات کو تشکیل کیا۔ علاوہ ازیں پنجاب اور دوسرے علاقوں میں بسنے والے آپ کے

ساتھی بھی آپ کے ان مضامین کے باعث بے چینی محسوس کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں آپ کی ہمدردیاں احمدیہ تحریک کے ساتھ تھیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ کے ان مضامین سے احمدی از حد خوشی محسوس کرتے تھے، احمدی پریس خاص طور پر آپ کے خلاف اس غلط فہمی کو پھیلانے کا موجب تھا۔

بہرحال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میری آپ کے متعلق رائے غلط تھی۔ میں بذاتِ خود مذہبی معاملات میں نہیں الجھتا مگر احمدیوں سے خود انہیں کے میدان میں مقابلہ کرنے کی خاطر مجھے اس بحث میں حصہ لینا پڑا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان مضامین کو لکھتے وقت ہندوستان اور اسلام کی بہتری میرے پیشِ نظر تھی اور میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے لاہور میں آپ سے ملنے کا موقع گنوا دیا۔ میں ان دنوں اتنا بیمار تھا کہ اپنے کمرہ سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ میں اپنی بیماری کے باعث تقریباً ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں۔ آئندہ آپ جب لاہور آئیں تو مجھے اپنی آمد سے ضرور مطلع کریں۔ کیا آپ کو میرا شہری آزادی کے متعلق خط مل گیا ہے؟ چونکہ آپ نے خط میں اس کے ملنے کی اطلاع نہیں دی اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ وہ خط آپ تک پہنچ نہیں پایا۔

آپ کا مخلص: محمد اقبال

(۲۱جون ۱۹۳۶ء)

(بحوالہ: ''شرح نفائس اقبالؒ'' از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر، فیصل آباد)

نیا نبی، اطاعت کا نیا مرکز

(۱۸ستمبر ۲۰۱۹ء کو یوٹیوب چینل ''کے ٹی وی آفیشل'' پر نشر ہونے والے انٹرویو سے اقتباس)

......میں علامہ محمد اقبالؒ کے حوالے سے بات کروں گا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے جب کہا کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں تو پنڈت جواہر لال نہرو نے ان سے پوچھا تھا کہ وہ مسلمان کیوں نہیں ہیں، وہ قرآن کو بھی مانتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مانتے ہیں۔ تو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ مانتے ہوں گے لیکن نیا نبی اور نئی وحی ماننے کے بعد یہ پہلی امت سے الگ ہو گئے ہیں، جب نیا نبی آتا ہے تو مرکزِ اطاعت بدل جاتا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ اطاعت کا مرکز رسول کی ذات ہوتی ہے۔ وہ ذات جس کی بات کسی دلیل کے بغیر واجب الاطاعت ہوتی ہے، وہ صرف پیغمبر کی ذات ہے۔ اگر آپ نے نیا پیغمبر مان لیا تو پہلا پیغمبر اگرچہ پیغمبر تو رہتا ہے لیکن واجب الاطاعت نہیں رہتا۔ ہم حضرت عیسیٰؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا رسول مانتے ہیں، وہ ہمارے سر کا تاج ہیں، لیکن واجب الاطاعت ان کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں۔ ہم حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا رسول مانتے ہیں، ان کے قدموں کی خاک ہیں ہم، لیکن واجب الاطاعت ہم حضورؐ کی ذات کو مانتے ہیں۔ نیا نبی ماننے کے بعد واجب الاطاعت پہلے پیغمبر نہیں رہتا بلکہ اطاعت کی اتھارٹی نیا پیغمبر ہو جاتا ہے۔

اقبالؒ نے کہا تھا کہ جب قادیانی نیا نبی اور نئی وحی مانتے ہیں تو انہوں نے اطاعت کی اتھارٹی تبدیل کر لی ہے اور ان کا مذہب الگ ہو گیا ہے، اس لیے یہ مسلمان نہیں کہلا سکتے، نیا نام اختیار کریں۔ یہی جھگڑا ہے۔

امتِ مسلمہ بحیثیت امت قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتی۔ پورے عالمِ اسلام کی مذہبی اتھارٹیاں انہیں مسلمان نہیں مانتیں۔ پاکستان کی پارلیمنٹ، سپریم کورٹ اور سول سوسائٹی انہیں مسلمان نہیں مانتے، تو پھر قادیانی دھکا کیوں کر رہے ہیں؟ میرا سوال ہے عالمی اداروں سے کہ وہ پوری امتِ مسلمہ کے خلاف چند ہزار یا چند لاکھ افراد کے اس گروہ کی ضد کو سپورٹ کیوں کر رہے ہیں؟ میرا یہ سوال اقوام

متحدہ سے ہے، صدر ٹرمپ سے ہے، یورپی یونین سے ہے، جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن سے ہے کہ پوری امتِ مسلمہ کو آپ رد کر رہے ہیں، آپ کہاں کھڑے ہیں، آپ کی اخلاقی پوزیشن کیا ہے؟ بھئی! سیدھی سی بات ہے، قادیانی نئے نبی اور نئی وحی سے دستبردار ہو کر اپنے سابقہ عقیدے پر واپس آجائیں، یا پھر فیصلہ تسلیم کریں، تیسرا کوئی راستہ تھا، نہ ہے، نہ ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اسلامی عقائد رکھنے کے باوجود قادیانی مسلمان کیوں نہیں؟

(۸ ستمبر ۲۰۲۳ء کو ختمِ نبوت کانفرنس ملکوال ضلع منڈی بہاءالدین
سے خطاب کا کچھ حصہ)

......ایک سوال عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ قادیانی کلمہ پڑھتے ہیں، بلکہ ہمارے روکنے کے باوجود پڑھتے ہیں، قرآن کریم بھی پڑھتے ہیں، جناب نبی کریمؐ کا نام بھی لیتے ہیں، بیت اللہ کی بات بھی کرتے ہیں، تو وہ مسلمان کیوں نہیں ہیں؟

آج کی یونیورسٹیوں، جدید تعلیمی اداروں اور عالمی ماحول میں یہ سوال اکثر پڑھے لکھے دوستوں سے کیا جاتا ہے۔ بالخصوص ان حضرات سے جو دینی ماحول سے فاصلے پر ہیں، جن کا مسجد، مدرسے، کسی دینی جماعت یا دعوت و تبلیغ کے ساتھ براہ راست تعلق نہیں ہے، ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ قادیانی کلمہ پڑھنے کے باوجود مسلمان کیوں نہیں ہیں؟ یہ سوال سب سے پہلے علامہ محمد اقبال مرحوم سے ہوا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے علامہ اقبالؒ سے یہ سوال کیا تھا جب انہوں نے انگریز حکومت سے مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو ہمارے کھاتے میں نہ لکھا جائے بلکہ ہم سے الگ غیر مسلموں میں لکھا جائے، یہ ہمارے مذہب و ملت کا حصہ نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو جو اس وقت بڑے قومی لیڈر تھے، انہوں نے علامہ اقبالؒ سے سوال کیا کہ جب قادیانی کلمہ پڑھتے ہیں، محمد رسول اللہ کو مانتے ہیں، قرآن پاک کی بات کرتے ہیں، تو یہ مسلمان کیوں نہیں ہیں؟ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے سے قادیانی اسی سوال سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔ اس لیے تعلیم یافتہ طبقے، وکلاء، تاجر برادری اور طلباء سے میری گزارش یہ ہوتی ہے کہ علامہ اقبالؒ اور پنڈت جواہر لال نہرو کی خط و کتابت پڑھیں۔ اصل انگریزی میں ہے جبکہ اس کا اردو ترجمہ بھی چھپا ہوا کتابی شکل میں موجود ہے، جس میں علامہ اقبالؒ نے اس سوال کی وضاحت کی تھی کہ قادیانی کلمہ پڑھنے کے باوجود، جناب نبی کریمؐ کو اللہ کا رسول کہنے کے باوجود اور قرآن پاک پڑھنے کے باوجود مسلمان کیوں نہیں ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے نہرو کو یہ جواب دیا کہ پیغمبر وہ ہوتا ہے جو خود اتھارٹی ہو، جس کو کسی دلیل کی

ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ہر ایک کو دلیل کی ضرورت پڑتی ہے، چاہے کوئی امام، خلیفہ، مجتہد یا فقیہ ہو، وہ قرآن یا حدیث کا حوالہ دینے کا پابند ہوتا ہے۔ پیغمبر واحد شخصیت ہوتی ہے جس کو کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود حوالہ اور اتھارٹی ہوتا ہے۔ اس لیے جب کسی امت میں پیغمبر بدل جاتا ہے تو مذہب بدل جاتا ہے، کیونکہ نبی کے بدلنے سے اتھارٹی تبدیل ہو جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ حضرات اس خط وکتابت کا ضرور مطالعہ کریں، جس سے آپ کو یہ بات سمجھ آئے گی کہ قرآن پڑھنے کے باوجود، جناب رسول اللہ کو نبی ماننے، اور کلمہ پڑھنے کے باوجود قادیانی مسلمان کیوں نہیں ہیں، یا ان کے نزدیک ہم مسلمان کیوں نہیں ہیں۔......

پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر

”جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے“

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ۔ مئی ۱۹۹۲ء)

علامہ محمد اقبالؒ نے افغانستان پر برطانوی استعمار کی یلغار کی ناکامی پر فرنگیوں کے جذبات کی عکاسی ان الفاظ سے کی تھی۔

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

مگر جب افغانیوں کی غیرتِ ملی کا ترجمان اور محافظ ملّا فرنگی استعمار کے ہاتھوں افغانستان کے کوہ و دمن سے جلاوطن نہ ہو سکا تو یہ دردِ سر روسی استعمار نے اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ اور یہ سوچ کر افغانستان کو ملّا اور اس کے دین وثقافت سے نجات دلانے پر کمر باندھ لی کہ برطانوی استعمار کی کامیابی کی راہ میں شاید جغرافیائی فاصلے رکاوٹ بن گئے ہوں، اور روس اور افغانستان کے درمیان ان فاصلوں کا فقدان اس مشن میں روس کی کامیابی کی ضمانت بن جائے۔ روحانی اقدار اور اخلاقی روایات کی کارفرمائی کے منکر سوویت حکمرانوں کی نظر اس ”ظاہر“ سے آگے نہ جا سکی، اور ایمان و یقین، عزیمت و استقامت اور وارفتگی و شیدائیت کی وہ ٹھوس رکاوٹیں ان کی نگاہوں سے اوجھل رہیں، جن سے ٹکرانے کی عبرتناک سزا سوویت یونین کے افغانیوں کے سامنے سپر انداز ہونے اور پھر ریت کی دیوار کی طرح بکھرتے چلے جانے کی صورت میں تاریخِ عالم کا ناقابلِ فراموش حصہ بن چکی ہے۔

مسجد کی چٹائیوں میں مانگے تانگے کی روٹیوں کو الحمد للہ کہہ کر حلق سے اتار کر ”قال اللہ و قال الرسولؐ“ کا درس حاصل کرنے والے اس ملّا کو تہذیبِ مغرب کے پرستاروں نے کون کونسے طعنے سے نہیں نوازا؟ اسے رجعت پسند، دقیانوسی، بنیاد پرست، کٹ ملا، عقل و شعور سے عاری، ہٹ دھرم، اندھا مقلد، لکیر کا فقیر، اور جمودِ ذہنی کا شکار جیسے القابات دیے گئے، اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کا دروازہ اس پر بند کر کے اسے ”اچھوت“ بنانے کی اجتماعی مہم چلائی گئی۔ لیکن وقت آنے پر وہی ملّا افغانیوں کی غیرتِ ملی کا عنوان بن کر ابھرا اور اپنے ایمان و یقین کی قوت کے ساتھ روسی استعمار کی

یلغار کے سامنے سدِ سکندری بن گیا۔ آج افغان مجاہدین کی کامیابی پر بارگاہِ ایزدی میں پوری امتِ اسلامیہ سجدہ ریز ہے اور جہادِ افغانستان کے ثمرات و نتائج کی فہرست بن رہی ہے۔ سوویت یونین کا خاتمہ، مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کی آزادی، افغانستان کی آزادی، اور پورے عالمِ اسلام میں جہاد کے جذبات کا فروغ ان ثمرات میں سرفہرست نظر آرہے ہیں۔ لیکن ہمیں افغان مجاہدین کے مقدس خون کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر ایک اور فیصلہ بھی لکھا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کو اقبالؒ کا شاہین مل گیا ہے اور اقبال کا مردِ مومن اپنے چہرے سے تاریخ کی گرد جھاڑ کر قوم کے سامنے آکھڑا ہوا ہے، اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے، اور وہ کابل کی پل خشتی کی مسجد کی بوسیدہ چٹائیوں پر کھڑا تہذیب مغرب کے اندھیروں میں سرگرداں امتِ مسلمہ کو آواز دے رہا ہے کہ ؎

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

''اسلامی سیکولرازم'' کا سبق

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد- یکم فروری ۲۰۰۲ء)

...... اب ''اسلامی سیکولرازم'' کی اصطلاح مسلمانوں کے منہ میں ڈالی جارہی ہے اور یہ کہہ کر کہ ''سیکولر کا مطلب لادینیت نہیں ہے'' مسلمانوں کو یہ سبق دیا جارہا ہے کہ وہ ''اسلامی جمہوریت'' اور ''اسلامی سوشلزم'' کی طرح ''اسلامی سیکولرازم'' کی گولی بھی نگل لیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ مسلمان بالخصوص پاکستانیوں کے حلق سے یہ گولی زبردستی اتارنے والی قوت رائے عامہ نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے بھی عالمی دباؤ اور فوجی قوت کو ذریعہ بنانے میں عافیت محسوس کی جارہی ہے۔ اس لیے اس کے حتمی نتیجے کے بارے میں بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم صدر پرویز مشرف سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے ترجمان کی وضاحت بہت اچھی ہے، لیکن ان کے اقدامات، بیانات اور فیصلوں سے دنیا میں جو تاثر لیا جارہا ہے اور انہیں پاکستان کو جس سمت لے جاتے دیکھا جارہا ہے، اور اس تناظر اور تاثر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور وہ اس کے لیے جو تاویل اور وضاحت بھی پیش کریں وہ باقی سب کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے، مگر پاکستان کے قیام کے لیے ایک نئی اسلامی ریاست کے قیام کی تجویز پیش کرنے والے علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور تحریکِ پاکستان کی قیادت کرنے والے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے لیے کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہو گا، جنہوں نے اسلامی قومیت کا نظریہ پیش کیا، قرآن وسنت کو پاکستان کا دستور بنانے کا اعلان کیا، اسلامی معیشت کو نئی ریاست کی منزل قرار دیا، اور اسلامی تہذیب وثقافت کے اَحیا کو پاکستان کا اصل مقصد بنایا۔

صدر جنرل پرویز مشرف اور رئیل ازم

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۲اپریل ۲۰۰۲ء)

......ہم صدر محترم کے طویل خطاب کے صرف ایک حصہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جس میں انہوں نے "آئیڈیل ازم" اور "رئیل ازم" کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور قوم کو یہ سبق دیا ہے کہ آئیڈیل ازم کے پیچھے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں اور رئیل ازم ہی سب کچھ ہے جس کے بغیر ہم قوموں کی موجودہ برادری میں جگہ حاصل نہیں کر سکتے، اس لیے عالمی برادری کی خواہشات اور مطالبات پر وہ جو کچھ کر رہے ہیں یا جو کچھ کرنا چاہ رہے ہیں اس پر صاد کیا جائے اور ان کا اس میں ساتھ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کالم نویسوں کو طعنہ دیا ہے کہ وہ ان کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر بہت کچھ لکھتے جا رہے ہیں اور ان کو حالات کا کچھ علم نہیں ہے۔......

ہم بصد ادب واحترام یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کے حوالہ سے یہ بات اسی روز طے ہوگئی تھی جب مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے معروضی حالات اور ان کے منطقی نتائج کو قبول کرنے سے قطعی انکار کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے جنوبی ایشیا میں الگ سلطنت کا تصور پیش کیا تھا، اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس تصور کی تکمیل کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سیاسی مشن قرار دے کر پاکستان کے نام سے ایک الگ اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ یہ رئیل ازم سے آئیڈیل ازم کی طرف سفر تھا اور اس سفر کے بیس کیمپ کے طور پر "پاکستان" کی الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ہم اس سے قبل بھی اس کالم میں عرض کر چکے ہیں کہ گزشتہ صدی کے آغاز میں عالم اسلام کو دو لیڈر ملے تھے:

- ایک مصطفیٰ کمال اتاترک، جنہوں نے آئیڈیل ازم کو ترک کرنے کا راستہ اختیار کیا تھا اور خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کر کے عالمی برادری کے تقاضوں اور خواہشات کے مطابق رئیل ازم کے تحت ترکی کو سیکولر جمہوریہ قرار دیا تھا،
- اور دوسرے قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے جنہوں نے رئیل ازم کو مسترد کر کے آئیڈیل ازم

کی طرف قدم بڑھایا، اور جدوجہد کرتے ہوئے عین اس دور میں اسلام کے نام پر ایک ریاست بناڈالی جب پوری دنیا میں اسلام بلکہ نفسِ مذہب کو ریاستی معاملات سے الگ کیا جا رہا تھا، اور مذہبی اقدار و روایات کو حکومتی معاملات سے لاتعلق کرنے کا عمل عالمی سطح پر آخری مراحل میں داخل ہو گیا تھا۔

اس وقت کا ریئل ازم وہی تھا جس کا اظہار مصطفیٰ کمال اتاترک نے کیا تھا اور جس کو اپنا کر عربوں نے خلافت کا ادارہ ختم کرنے کے بعد نئے عالمی سسٹم کی سرپرستی میں علاقائی قومیتوں کے عنوان سے الگ الگ ریاستی تشخصات قائم کر لیے تھے۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ بھی ریئل ازم پر صاد کر دیتے تو اس سارے بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، نہ برصغیر تقسیم ہوتا، نہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہوتا، نہ کروڑوں مسلمان بے گھر ہوتے، نہ جنوبی ایشیا میں پاکستان اور بھارت کے نام سے کشیدگی اور تصادم کے دو الگ الگ کیمپ قائم ہوتے، نہ کشمیر کا مسئلہ ہوتا، نہ اسلحہ کی دوڑ لگتی، نہ غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی سے دونوں طرف جرنیلوں کی ظفر موج وجود میں آتی، اور نہ ہی دونوں طرف بڑی بڑی فوجیں ملکی وسائل اور عوامی دولت کے ایک بڑے حصے پر ہاتھ صاف کر کے دونوں ملکوں کی معاشی ترقی اور عوامی خوشحالی کا راستہ روکتیں۔

یہ سب کچھ ریئل ازم سے دستبردار ہونے اور آئیڈیل ازم کو منزلِ مقصود قرار دینے کا نتیجہ ہے، اور جنوبی ایشیا کے کروڑوں مسلمان گزشتہ پون صدی سے یہ ساری قربانیاں صرف اور صرف آئیڈیل ازم کے لیے دے رہے ہیں، جس آئیڈیل ازم کی وضاحت خود قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ جلسہ میں ان الفاظ کے ساتھ کی تھی کہ:

> ”مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت کیا ہوگا؟ پاکستان کا طرزِ حکومت متعیّن کرنے والا میں کون؟ یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے اور میرے خیال میں مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے تیرہ سو برس قبل قرآن کریم نے فیصل کر دیا تھا۔“

اس لیے ہم صدر جنرل پرویز مشرف سے اس حوالہ سے دو گزارشات کرنا چاہتے ہیں:

۱. ایک یہ کہ آئیڈیل ازم سے قوم کی توجہ ہٹا کر اسے ریئل ازم پر لانے کے لیے انہیں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی گزشتہ پون صدی کی جدوجہد، قربانیوں اور ملی سفر کی نفی کرنا ہوگی

کیونکہ پاکستان ریئل ازم کے لیے نہیں بلکہ آئیڈیل ازم کے لیے وجود میں آیا ہے۔

۲. اور دوسری بات یہ ہے کہ جب ان کے ذہن میں ایجنڈا مصطفیٰ کمال اتاترک والا ہے تو اس کے اظہار اور اعتراف میں وہ حجاب کیوں محسوس کر رہے ہیں؟ اور اس کے لیے انہیں قائداعظمؒ کا نام لینے اور ان کی چھتری استعمال کرنے کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے؟

پاکستان، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مرکز!

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۹ مارچ ۲۰۰۴ء)

...... پاکستان بنانے والوں نے اسے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے مرکز اور مسلم دنیا کی قیادت کے لیے تشکیل دینے کا تصور پیش کیا تھا۔ علامہ محمد اقبالؒ کا خواب یہی تھا اور قائداعظمؒ تحریکِ پاکستان کے دوران میں مسلسل یہ بات دہراتے رہے کہ وہ اسلامی تہذیب کے اَحیا اور ایک فلاحی اسلامی ریاست کا نمونہ پیش کرنے کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن آج یہ سارا فلسفہ، پوری سوچ اور مکمل جدوجہد جنوبی ایشیا کی اجتماعیت اور عالمی ہم آہنگی کے نام پر عالمی استعمار کے ایک اشارۂ ابرو پر قربان کی جا رہی ہے۔

یہ امتحان کا وقت ہے اور آزمائش کا مرحلہ ہے، علماء کرام کے لیے بھی اور محبِ وطن دانشوروں کے لیے بھی کہ وہ قوم کو اس بحران سے نکالنے کے لیے کیا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری دینی قیادت اور قومی دانش کو اس نازک مرحلہ میں صحیح اور دانش مندانہ فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ

(روزنامہ پاکستان، لاہور-۱۹جولائی ۲۰۰۶ء)

قائداعظم محمد علی جناحؒ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے وہ عظیم سیاسی رہنما ہیں جن کی کوششوں سے پاکستان کے نام پر اس وقت ایک ایسی اسلامی سلطنت وجود میں آئی، جب دنیا بھر میں ریاست کے ساتھ مذہب کا تعلق ختم کرنے کا سلسلہ عروج پر تھا، حتیٰ کہ اسلامی خلافت کی نمائندگی کرنے والی سلطنتِ عثمانیہ بھی اپنا وجود کھو چکی تھی، اور خلافتِ عثمانیہ کے مرکز ترکی نے یورپ کی پیروی میں ریاست اور اجتماعیت کے ساتھ اسلام کا تعلق منقطع کر کے سیکولر ملک کا روپ دھار لیا تھا۔

ایسے ماحول میں مغرب کے تعلیم یافتہ ایک سوٹڈ بوٹڈ سیاسی رہنما کا اسلام کے نام پر ایک نئے ملک کے قیام کی مہم چلانا اور پھر ایسی ریاست قائم کر دینا اچنبھے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی فکری رہنمائی کا کرشمہ تھا جنہوں نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو اس راستے پر لگایا، اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو اپنے لیے ایک الگ ریاست کا تصور پیش کر کے انہیں ایک نئی سیاسی مہم کی بنیاد فراہم کی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے اور یہ امرِ واقعہ ہے کہ پاکستان کے فکری رہنما اصل میں علامہ اقبالؒ ہی ہیں، انہی کی سوچ اور فکر نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو اپنے لیے الگ ملک کے حصول کی جدوجہد پر آمادہ کیا۔ جبکہ قائداعظمؒ کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ان جذبات کی کامیاب سیاسی ترجمانی کی اور ایک اچھے وکیل کا کردار ادا کیا۔

......

''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ''

(روزنامہ اسلام، لاہور ـ ۷ جنوری ۲۰۱۱ء)

...... مغرب کا المیہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم کو اور ہر بات کو اپنے ماحول اور ذہنی دائروں میں پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی سوسائٹی میں رنگ و نسل اور ذوق و مزاج کے فرق کے ساتھ ساتھ نفسیات، جذبات اور ذہنی دائروں میں بھی فرق رکھا ہے، جسے ختم کرنا اور ہر مسئلہ کو کسی ایک قوم یا طبقے کے مزاج و نفسیات کے معیار پر لانا ممکن ہی نہیں ہے۔ مسلمانوں کی اپنی ذہنی ساخت ہے، نفسیات ہیں، جذبات ہیں اور ذوق و مزاج ہے، جسے علامہ اقبالؒ نے

ع خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

سے تعبیر کیا ہے، اور اس کا لحاظ رکھے بغیر اسے ڈیل کرنے والوں نے ہمیشہ نقصان اٹھایا ہے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ عباسی خلافت کے دور میں کسی مسیحی دانشور نے ایک مسلمان عالم سے کہا تھا کہ تمہارے پیغمبرؐ عجیب ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتیں حتیٰ کہ پیشاب پاخانہ کے آداب بھی بتاتے ہیں۔ مسلمان عالم نے جواب دیا کہ جو بات تمہارے نزدیک اعتراض کی ہے وہی ہمارے نزدیک خوبی اور کمال کی ہے کہ ہمارے پیغمبرؐ کی تعلیمات میں اس قدر جامعیت ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات میں خود ہماری راہنمائی فرماتے ہیں اور راہنمائی کے کسی درجے میں بھی ہمیں دوسروں کا محتاج نہیں رہنے دیتے۔

اسی طرح مسلمان کا قرآن کریم کے ادب و احترام اور جناب نبی اکرمؐ کی حرمت کے حوالے سے حسّاس ہونا اور جذبات کا اظہار کرنا مغرب کے نزدیک اعتراض کی بات ہے، مگر ہمارے ہاں یہ خوبی اور کمال کی بات ہے کہ کوئی مسلمان آج بھی نہ قرآن کریم کی توہین برداشت کرتا ہے اور نہ ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں کسی درجہ کی توہین اسے گوارا ہوتی ہے۔

مغربی فکر وفلسفہ کا ناقدانہ علمی جائزہ لینے کی ضرورت

(ڈاکٹر محمد اکرم ورک کی کتاب ''متونِ حدیث پر جدید ذہن کے اشکالات: ایک تحقیقی جائزہ'' کے پیش لفظ سے اقتباس۔
مطبوعہ ماہنامہ الشریعہ، فروری ۲۰۱۲ء)

......جہاں تک اس جذبے کا تعلق ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر مغرب کے اعتراضات کا محققانہ جواب دینا ضروری ہے، یہ انتہائی قابلِ قدر ہے۔ اسی طرح نکاح اور رخصتی کے وقت ام المومنین حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں یہ بحث ایک عرصے سے جاری ہے اور بحث وتحقیق کی حد تک اس میں کوئی اشکال کی بات بھی نہیں ہے۔ ہر مؤرخ اور محقق کا حق ہے کہ روایات کی بنیاد پر اپنی تحقیق کے مطابق کوئی رائے قائم کرے اور اس کا اظہار بھی کرے۔ اس نوعیت کے سیکڑوں مسائل امت کے اہلِ علم میں مختلف فیہ چلے آ رہے ہیں اور ان پر بحث وتمحیص کا سلسلہ بھی جاری ہے، جبکہ آئندہ بھی قیامت تک ان مباحث کا دروازہ کھلا ہے۔

البتہ بحث کا یہ پہلو کہ جناب نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں مغرب کے اعتراضات اور طعن وتشنیع کا جواب دینے کے لیے ہم اپنی ہی روایات اور علمی اثاثے کی اکھاڑ پچھاڑ میں لگ جائیں، بہرحال قابلِ توجہ ہے۔ اور ہمارے خیال میں ایسے مسائل میں اپنے علمی ذخیرے کے درپے ہونے سے پہلے ہمیں اس بات کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ مغرب کے اعتراضات کی فکری اساس کیا ہے؟ اور اس طعن وتشنیع کی اپنی علمی حیثیت کیا ہے جس کی بنیاد پر اسلام کی تعلیمات یا جناب نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کو موردِ طعن قرار دیا جا رہا ہے؟ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ مغرب کے اٹھائے ہوئے مطاعن واعتراضات کی علمی حیثیت کا تجزیہ کیا جائے، اور ہر مغربی اعتراض کو درست تسلیم کرنے کی بجائے اس کی خامی کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر ہمارا المیہ ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ کے بعد مغربی فلسفہ وثقافت کا اس سطح پر ناقدانہ جائزہ لینے والا اور کوئی مفکر سامنے نہیں آیا۔ اور اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ خود اقبالؒ کا نام لینے والے اس معاملے میں اقبالؒ کی راہ پر چلنے کی بجائے مغربی فلسفہ وثقافت کی نام نہاد علمی برتری کے سامنے سربسجود دکھائی دے رہے ہیں۔......

فاروق ستار کا مغالطہ

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۲مارچ ۲۰۱۲ء)

...... فاروق ستار ایک سیاسی پارٹی کے اہم لیڈر ہیں، انہیں ہر وہ بات کہنے کا حق ہے جو ان کے ذہن میں آئے۔ لیکن ہماری گزارش ہے کہ وہ کوئی بات کہتے ہوئے زمینی حقائق کا بھی لحاظ کر لیا کریں۔ اس لیے کہ زمینی حقائق اور تاریخی پس منظر سے ہٹ کر کہی جانے والی کوئی بھی بات وقتی طور پر ہال میں بیٹھے ہوئے سامعین سے واہ واہ کی داد تو وصول کر سکتی ہے، مگر تاریخی تعامل پر نظر رکھنے والے کسی بھی شخص کے لیے ایسی بات قابلِ توجہ نہیں ہوتی اور نہ ہی ایسی بات کوئی مثبت نتیجہ حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم فاروق ستار کے اس ارشاد کا حوالہ دینا چاہیں گے کہ یہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کا ملک ہے، یہاں سب برابر ہیں اور کوئی اقلیت یا اکثریت نہیں ہے۔ اس بات کو ہم اگر خود قائداعظمؒ کی تاریخی جدوجہد کے تناظر میں دیکھنا چاہیں تو صورتحال اس کے بالکل برعکس دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے کہ جنوبی ایشیا میں سیاسی طور پر اقلیت واکثریت کے عنوان سے بات کرنے والے سب سے پہلے سیاسی لیڈر قائداعظم محمد علی جناحؒ ہیں۔

مسلم اور غیر مسلم کے فرق کو پیش کرنے اور اس کو اجاگر کرنے کی محنت کرنے والوں میں تعلیمی محاذ پر سر سیّد احمد خانؒ، تہذیبی وثقافتی میدان میں علامہ محمد اقبالؒ، اور سیاسی دنیا میں قائداعظم محمد علی جناحؒ سب سے نمایاں شخصیات ہیں۔ فاروق ستار کے علم میں یہ بات یقینی طور پر ہوگی کہ یہ لوگ اس دور میں بھی سیاسی طور پر مسلم وغیر مسلم کے فرق کی بات کر رہے تھے جب جنوبی ایشیا کے علماء کرام کا ایک بڑا طبقہ اس فرق سے ہٹ کر سیاسی میدان میں متحدہ قومیت کا پرچم تھامے ہوئے تھا۔ سوال یہ ہے کہ برصغیرِ پاک وہند وبنگلہ دیش میں اگر مسلم وغیر مسلم کے فرق کی بات سر سیّد احمد خانؒ، علامہ محمد اقبالؒ، اور قائداعظمؒ نے نہیں کی تو اس تفریق کی بات اور کس نے کی ہے؟ اگر فاروق ستار اس کی نشاندہی کر سکیں تو نہ صرف ہم پر بلکہ تاریخ پر ان کا احسان ہوگا۔

علامہ محمد اقبالؒ تو مسلم وغیر مسلم کے فرق کو اجاگر کرنے میں اس قدر حسّاس تھے کہ انہوں نے

مسلمانوں کے اجماعی عقائد سے منحرف ہونے والے قادیانیوں کو بھی غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس لیے اس فرق کی بات ملک کے دستور و قانون کے حوالے سے بیت اللہ محسودؒ کی نہیں بلکہ خود قائداعظمؒ کی ہے، جبکہ فاروق ستار اسے بیت اللہ محسودؒ کے کھاتے میں ڈال کر تاریخی حقائق اور قائداعظمؒ کی پوری جدوجہد کا مذاق اڑا رہے ہیں۔......

’’عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں‘‘

(۲۰اگست ۲۰۱۲ء کو جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ میں
عیدالفطر کے اجتماع سے خطاب کا ایک حصہ)

...... عید کے حوالے سے قرآن وحدیث میں ان چند ایام کا ذکر ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیے ہیں اور ہمارے لیے ان سب میں سبق موجود ہے۔

عید کا مفہوم اور مقصد کیا ہے؟ اس حوالہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک ارشاد گرامی ہے کہ ''كل يوم لا يعصى الله فيه عزوجل فهو لنا عيد''۔ ہر وہ دن جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے بغیر گزر جائے وہ ہمارے لیے عید کا دن ہے۔ یعنی مسلمان کی اصل عید یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے اور اس کی رضا کا حقدار قرار پائے۔ ایک انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اسے ہدایت مل جائے اور وہ دوزخ سے بچ کر جنت میں چلا جائے، اور ایسا اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہی مسلمان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، حتیٰ کہ جنت میں داخل ہونے والوں کو بھی ساری نعمتیں مل جانے کے بعد جو سب سے بڑی اور آخری نعمت ملے گی وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی جسے ''ورضوان من الله اكبر'' (التوبہ ۷۲) کہا گیا ہے۔ اس لیے حضرت علیؓ عید کا مفہوم ومقصد یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے انسان محفوظ رہے اور اس کی رضا کا مستحق ٹھہرے۔

میں اس بارے میں ایک بات علامہ اقبالؒ کے حوالہ سے بھی کرنا چاہوں گا، اس لیے کہ امیرِ شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا ایک عجیب ارشاد میں نے کسی جگہ پڑھا ہے، وہ فرماتے تھے کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو قرآن کریم کا مطالعہ کرنا چاہیے، اگر وہ سیّد احمد شہیدؒ کی طرح نہیں پڑھ سکتے تو کم از کم علامہ اقبالؒ کی طرح ہی پڑھ لیں۔ اور علامہ اقبالؒ نے عید کے بارے میں کہا ہے کہ

ع عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دین

کہ آزاد قوموں کی عید تب ہوتی ہے جب ملک باوقار ہو اور دین سربلند ہو۔ آج ہمارا دین کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور ہمارے ملک کی کیا حالت ہے؟ ہماری اصل عید تو اس دن ہوگی جب ملک کو حقیقی

آزادی حاصل ہوگی، قوم خود مختار ہوگی، دین سربلند ہوگا، اور ہم اپنے دین کے نفاذ اور سربلندی کے لیے سرگرم عمل ہوں گے۔ اس لیے کہ غلاموں اور مجبوروں کی عید بھی کیا عید ہوتی ہے؟

آئیے مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حقیقی عید نصیب فرمائیں، ملکی آزادی، قومی خود مختاری اور دین کی سربلندی کی منزل سے ہمکنار کریں۔ اور ہماری رمضان المبارک کی عبادات کو قبول فرماتے ہوئے آئندہ بھی خلوص اور ذوق کے ساتھ عبادت کی توفیق دیتے رہیں، آمین یارب العالمین۔

نظریۂ پاکستان سے بے خبری اتفاقی نہیں

(روزنامہ اسلام، لاہور … ۱۹ اپریل ۲۰۱۳ء)

نظریۂ پاکستان کے خلاف کالم لکھنے پر ملک کے معروف صحافی ایاز میر کے کاغذات نامزدگی ریٹرننگ آفیسر کی طرف سے مسترد کیے جانے کے بعد سیکولر اخبار نویسوں کے ہاتھ میں نظریۂ پاکستان کے بارے میں اپنے منفی جذبات کا اظہار کرنے کا ایک اور موقع آگیا ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں پوری مستعدی دکھارہے ہیں۔ ایک بار پھر یہ سوال کھڑا کیا جارہا ہے کہ ''نظریۂ پاکستان'' کیا ہے اور اس کی تعبیر وتشریح کیا ہے؟ یہ بات ایسے لہجے میں کہی جارہی ہے جیسے ان دوستوں کو سرے سے نظریۂ پاکستان کے بارے میں کچھ علم ہی نہ ہو۔ حالانکہ یہ سب کچھ جانتے ہیں، انہیں بخوبی معلوم ہے کہ برصغیر یعنی متحدہ ہندوستان کی تقسیم کی سیاسی اور تہذیبی وجوہ کیا تھیں:

- وہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے بارے میں سرسیّد احمد خان مرحوم کی جدوجہد سے بے خبر نہیں ہیں،
- انہیں اس حوالے سے چودھری رحمت علی مرحوم اور علامہ اقبالؒ کے افکار اور ان کی طرف سے مسلمانوں کے لیے الگ ملک کی تحریک وتجویز کا پوری طرح علم ہے،
- اور تحریکِ پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناحؒ کے وہ اعلانات اور خطبات بھی انہوں نے پڑھ رکھے ہیں جن میں انہوں نے پاکستان کو اسلام کے نظریہ اور مسلمانوں کی جداگانہ تہذیبی شناخت کے تحفظ وبقا اور فروغ ونفاذ کی بنیاد قرار دیا تھا۔

مگر وہ ''تجاہلِ عارفانہ'' سے کام لیتے ہوئے نئی نسل کی اس سلسلہ میں بے خبری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ جبکہ نئی نسل کی یہ ''بے خبری'' بھی محض اتفاقی نہیں بلکہ ملک کے تعلیمی نظام و نصاب سے اسلام اور نظریۂ پاکستان کے بارے میں معلومات و مواد کو دھیرے دھیرے خارج کرکے اس بے خبری کا ماحول پیدا کیا گیا ہے اور اس خود ساختہ ماحول میں آج کی نسل کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھایا جارہا ہے کہ نظریۂ پاکستان آخر کیا چیز ہے؟ ……

علامہ محمد اقبالؒ کا پاکستان

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۱ اپریل ۲۰۱۴ء)

حضرت مولانا بشیر احمد پسروریؒ کے پوتے مولانا حافظ محمد عثمان نے پسرور ڈسکہ روڈ پر دارالعلوم رشیدیہ کے نام سے ایک دینی درسگاہ کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ وہاں مسجدِ اقصیٰ کی طرز پر اسی عنوان سے ایک وسیع مسجد کی تعمیر کا پروگرام ہے۔ مولانا محمد عثمان کی خواہش تھی کہ مسجد کے سنگِ بنیاد کی اینٹ رکھنے کی سعادت میں حاصل کروں جو میرے لیے اعزاز کی بات تھی اور میں اس پر ان کا شکر گزار ہوں۔ جبکہ اس سے چند میل کے فاصلہ پر بَن باجوہ میں معہد الرشید الاسلامی کے نام سے ایک دینی مرکز قائم ہے۔ ہمارے محترم دوست بھائی ذوالفقار صاحب اپنے دوستوں کے ہمراہ اس کا نظام چلا رہے ہیں۔ مڈل کے ساتھ حفظ القرآن کریم کا امتزاج قائم کر رکھا ہے اور مسلسل پیشرفت کر رہے ہیں۔ شہر کے محلہ امید پورہ میں بھی اس کی ایک شاخ مسجد بلال میں کام کر رہی ہے، وہاں تقسیمِ اسناد کا جلسہ تھا، معہد الرشید الاسلامی میں تعلیم حاصل کرنے والے چار حفاظ کی دستار بندی تھی، مجھے اس میں حفظِ قرآن کریم کی اہمیت اور دینی مدارس کی خدمات پر گفتگو کرنا تھی۔ لیکن جب مسجد میں داخل ہوا تو کلاس کے لڑکے کھڑے ہو کر اجتماعی صورت میں علامہ محمد اقبالؒ کا مشہور ترانہ پڑھ رہے تھے جس کا ایک معروف شعر یہ ہے کہ۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بچوں سے یہ ترانہ سن کر میرے ذہن کا رخ بھی اقبالؒ کی طرف مڑ گیا اور میں نے گفتگو اقبالؒ اور قرآن کریم کے عنوان سے شروع کی جو چلتے چلتے ”اقبالؒ کا پاکستان“ کے موضوع میں تبدیل ہو گئی۔

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نوجوانوں کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ وہ قرآن کریم کا مطالعہ ضرور کریں، اگر سیّد احمد شہیدؒ کی طرح نہیں کر سکتے تو اقبالؒ کی طرح ہی مطالعہ کر لیں۔ اس کا حوالہ دے کر میں نے گزارش کی کہ آج کل ہمیں تلقین کی جا رہی ہے کہ اقبالؒ کے پاکستان کی بات کریں، اور اقبالؒ

نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے پاکستان کا جو ذہنی نقشہ پیش کیا تھا، اسے سامنے رکھیں۔ میں یہ بتانا چاہوں گا کہ اقبالؒ کا پاکستان کیا تھا؟ اور مفکرِ پاکستان نے ایک نئی اسلامی ریاست کی تجویز پیش کر کے اس ریاست کے جو خدوخال بیان کیے تھے، ان کو کس نے سامنے رکھا ہے اور کون ان سے منحرف ہو گیا ہے؟ ذرا ترتیب سے میری بات نوٹ کر لیں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ اقبالؒ اور اقبالؒ کا پاکستان کا نعرہ لگانے والوں نے اقبالؒ کے افکار و تعلیمات کا کیا حشر کر رکھا ہے، اور کون لوگ اقبالؒ کے تصورات کے مطابق پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں:

- اقبالؒ نے پنجاب اسمبلی میں سب سے پہلے یہ بل پیش کیا تھا کہ توہینِ رسالتؐ جرم ہے جس کی سزا مقرر ہونی چاہیے۔ توہینِ رسالتؐ پر سزا کی بات ہماری قانونی دنیا میں وہیں سے شروع ہوئی تھی جو ۲۹۵سی تک پہنچی۔ مگر آج اقبالؒ کے نام پر توہینِ رسالتؐ پر سزا کے قانون کی مخالفت کی جا رہی ہے اور اقبال اقبال کا ورد کرنے والے بہت سے دانشور اس قانون کو ختم کرانے کے درپے ہیں۔
- اقبالؒ نے کہا تھا کہ پاکستان کے نام سے قائم ہونے والی نئی ریاست میں نفاذِ اسلام پارلیمنٹ کے ذریعہ ہونا چاہیے، اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا اعلان کرتے ہوئے منتخب پارلیمنٹ کو قرآن وسنت کی حدود میں قانون سازی کرنی چاہیے۔ ملک کے دینی حلقوں نے اجتماعی طور پر اقبالؒ کے اس تصور کو قبول کر لیا، مگر اقبالؒ کے پاکستان کا نعرہ لگانے والے بہت سے لوگ پارلیمنٹ کو قرآن وسنت کا پابند قرار دینے کو پارلیمنٹ کی خود مختاری کے منافی کہہ کر پاکستان کے دستور کی اس نظریاتی اساس کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔
- اقبالؒ نے کہا تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور انہیں مسلم معاشرہ کا حصہ سمجھنے کی بجائے غیر مسلم اقلیتوں میں شمار کیا جائے۔ پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے اقبالؒ کی اسی تجویز کے مطابق قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تھا، مگر اس دستوری فیصلے کے خلاف مہم چلانے والے عناصر میں بعض اقبال اقبال پکارنے والے لوگ بھی نمایاں ہیں۔
- اقبالؒ نے کہا تھا کہ چونکہ پارلیمنٹ کو قرآن وسنت کے دائرہ اور روشنی میں قانون سازی کرنی ہے جس کے لیے قرآن وسنت کا علم ضروری ہے، جبکہ عوامی نمائندوں کے لیے قرآن و

سنت کا اس درجے کا عالم ہونے کی شرط موجودہ حالات میں قابلِ عمل نہیں ہے، اس لیے جید علماء کرام اور ماہرین قانون پر مشتمل ایک کونسل ہونی چاہیے جو اس سلسلہ میں پارلیمنٹ کی راہ نمائی کرے۔ دستور میں اقبالؒ کی اسی تجویز پر ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مگر بہت سے ''اقبالی'' اسلامی نظریاتی کونسل کو غیر ضروری قرار دے کر اس کو ختم کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔

- اقبالؒ نے اسپین کے دورے سے واپسی پر کہا تھا کہ یہ دینی مدارس جس حالت میں کام کر رہے ہیں انہیں اسی طرح کام کرنے دو۔ یہ اگر اس طرح کام نہ کرتے تو ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو اسپین پر عیسائیوں کے قبضے کے بعد وہاں کے مسلمانوں کا ہوا تھا کہ آج وہاں مسلمانوں کی تعداد برائے نام ہے۔ مگر آج اقبالؒ کے کچھ نام لیوا دینی مدارس کے اس کردار اور محنت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش اور کوشش ہے کہ انہیں قومی دھارے میں لانے کی آڑ میں ان کے آزادانہ تعلیمی و دینی کردار سے محروم کر دیا جائے۔

حضراتِ گرامی قدر! ان باتوں سے آپ خود فیصلہ کریں کہ کون اقبالؒ کے پاکستان کی بات کر رہا ہے اور کون اقبالؒ سے منحرف ہو گیا ہے؟ میں ان لوگوں سے امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہی کی زبان میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم مولویوں کی بات تم نہیں سنتے، تمہاری مرضی، لیکن اقبالؒ سے دستبردار کیوں ہو رہے ہو؟ اس کی تو سنو کہ اسی کی فکر پر تمہیں پاکستان کی یہ عظیم نعمت ملی ہے اور اسی کے نام کے نعرے لگا کر تم اپنا قد بڑھاتے ہو۔

بچوں کی زبان سے اقبالؒ کا ترانہ سن کر میرا ذہن اس طرف مڑ گیا اور میں نے یہ باتیں عرض کر دی ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمت پر دین، قوم اور ملک کی خدمت کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

قیامِ پاکستان کا مقصد

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ یکم مارچ ۲۰۱۵ء)

......قیام پاکستان کی جدوجہد اور دو قومی نظریہ کے حوالہ سے اگر مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ، بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ اور تحریکِ پاکستان کے دیگر قائدین کے واضح اعلانات کو دیکھا جائے تو بھی پاکستان کے قیام کا مقصد اسلام اور جمہوریت کے علاوہ کچھ اور طے نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ کسی ریاست کے قیام کے بنیادی مقصد کو اس کے دستور کے بنیادی ڈھانچہ کا درجہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد قراردادِ مقاصد اور تمام دساتیر میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے، حتیٰ کہ دینی حلقوں نے بھی علماء کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی صورت میں اسلام اور جمہوریت دونوں کو قومی زندگی کی اساس تسلیم کیا ہے، اور وہ بدستور اس موقف پر قائم چلے آرہے ہیں۔

اس پس منظر میں ہم اپنے اس احساس کا قومی حلقوں کے سامنے ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ حکومت کے موقف میں ملک کے دستور کے لیے کسی بنیادی ڈھانچے کی موجودگی سے انکار، دستوری حوالہ سے اسلام اور جمہوریت دونوں کے لیے یکساں خطرے کی گھنٹی ہے۔ اور قوم کو اس خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ نظریۂ پاکستان پر یقین رکھنے والی سیاسی پارٹیاں، وکلاء برادری، انسانی حقوق کے علمبردار حلقے، اور دینی جماعتیں مل بیٹھ کر باہمی مشاورت کے ساتھ اس مسئلہ کا کوئی متفق حل نکالیں اور قوم کو ایک نئے ممکنہ خلفشار سے بچانے کے لیے کردار ادا کریں۔......

”عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد“

(۲۰۱۷ء کے دوران الشریعہ اکادمی کالونی، گوجرانوالہ میں ”خلافت“ کے موضوع پر
سلسلۂ محاضرات کی ایک نشست سے اقتباس)

...... جب کوئی زمانہ شمار ہوتا ہے تو ابتدائی ایک سو سال اس کے ارتقا کا زمانہ ہوتا ہے، اور آخری سو، سوا سو سال تنزل کا زمانہ ہوتا ہے، عروج کا زمانہ درمیان کا ہوتا ہے۔ جیسے بنو امیہ کے اس آٹھ سو سال کے دور میں عروج کا دور تین سو سال کا تھا۔ علم، تہذیب، تمدن، فلسفہ کے لیے طاقت کی پشت پناہی ضروری ہوتی ہے ورنہ ختم ہو جاتا ہے۔ صرف علم، صرف تہذیب اور صرف فلسفہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے اگر دنیا پر ہزار سال حکومت کی ہے تو ہماری بنیاد علم اور اخلاقیات پر تھی، لیکن پشت پر طاقت تھی۔

آج اگر دنیا پر مغرب کا فلسفہ حکمرانی کر رہا ہے اور ہماری خواہشات کے علی الرغم کر رہا ہے، ہمارا ایک لمحہ کے لیے بھی جی نہیں چاہتا کہ ہم مغربی فلسفے کو قبول کریں لیکن ہمیں قبول کرنا پڑ رہا ہے، کیونکہ اس کی پشت پناہی طاقت کر رہی ہے۔ مغرب کا فلسفہ تمام تر کمزوریوں کے باوجود، تمام تر اعتراضات کے باوجود، دنیا کی مختلف قوموں کے تمام تر تحفظات کے باوجود آج دنیا کا حکمران ہے۔ جس کے سامنے چائنہ بھی بے بس ہے، چائنہ معیشت کے میدان میں ٹکر لے رہا ہے، فلسفے اور تہذیب و تمدن کے محاذ پر وہ وہیں کھڑا ہے جہاں مغرب کھڑا ہے، یہ سب کچھ طاقت کے بل بوتے پر ہو رہا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا

ع عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

نبوت کے ساتھ بھی طاقت ضروری ہے، حضرت داؤدؑ طاقت کے ذریعے ہی خلیفہ بنے۔ خلیفہ بننے کے لیے جالوت کو قتل کیا تھا ”وقتل داوٗد جالوت وآتٰہ اللہ الملک والحکمۃ وعلمہ مما یشاء“ (البقرہ ۲۵۱)۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں پہلے انہوں نے جالوت کو قتل کیا پھر میں نے ان کو حکومت، نبوت اور خلافت دی۔ مذہب، دین، عقیدہ آسمان سے آتا ہے اور دنیا میں طاقت ملتی ہے تو نظام چلتا ہے۔ ہم

آج مار کھا رہے ہیں کہ طاقت کا توازن ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جس کے پاس طاقت کا توازن نہیں ہے وہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی، دوسروں پر حکومت کیا کرے گی۔......

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی تعلیمات

(۲۵دسمبر۲۰۱۷ءکو یوٹیوب چینل "میج ٹی وی" پر گفتگو)

...... دوسری شخصیت قومی حوالے سے جو آج پچیس دسمبر کو یاد کی جاتی ہے وہ ہمارے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم جو ہمارے قومی لیڈر تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سے یہ خدمت لی کہ انہوں نے مسلم قوم کو اکٹھا کیا اور ہندوؤں کے عزائم کو بھانپتے ہوئے مسلم امہ کے لیے الگ ملک کا مطالبہ کیا، اور الگ ملک کا صرف مطالبہ نہیں کیا بلکہ اس کی بنیادیں بھی واضح کیں کہ یہ اسلام کے لیے، اسلامی نظام کے تجربے کے لیے، قرآن وسنت کے احکام کے لیے، شریعت کی بالادستی کے لیے، قائد اعظمؒ نے پاکستان کی قیادت بھی کی اور پاکستان کے اہداف بھی واضح کیے۔

بعض لوگ یہ مغالطہ پھیلاتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے یہ ساری باتیں پاکستان بننے سے پہلے لوگوں کو ساتھ ملانے کے لیے کی تھیں۔ یہ خود قائداعظم محمد علی جناحؒ پر زیادتی ہے، یہ کہنا ان کو اپنے اوپر قیاس کرنا ہے ایک سیاستدان کے طور پر، کہ وہ وقتی قسم کی بات کرنے کے عادی تھے۔ نہیں! قائداعظمؒ نے قیامِ پاکستان سے پہلے بھی پاکستان کا مقصد واضح کیا، اور قیامِ پاکستان کے بعد اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے انہوں نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر کی، میں سمجھتا ہوں کہ وہ تقریر قائداعظمؒ کی پوزیشن کو دوٹوک واضح کرنے کے لیے کافی وشافی ہے۔ انہوں نے اسٹیٹ بینک کا افتتاح کرتے ہوئے، اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے جو تقریر کی کہ میں پاکستان میں مغربی اصولوں کے مطابق نہیں، اسلام کے اصولوں کے مطابق معاشی نظام چاہتا ہوں، اسلام کے معاشی اصولوں کو یہاں نافذ دیکھنا چاہتا ہوں، اور انہوں نے یہ کہا تھا کہ میں اپنے معاشی ماہرین سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق معیشت کا ڈھانچہ استوار کریں گے۔

تو وہ ہمارے قومی لیڈر تھے، ملک کے بانی تھے، آج ان کا یومِ وفات بھی ہے، تو یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی وہ جدوجہد اور ان کے وہ خطابات جو انہوں نے پاکستان کے قیام کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے فرمائے تھے، ان کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے۔ اور پوری

قوم کی ذمہ داری ہے کہ ان کی طرف ہم اپنا رخ واپس کریں۔ ہم ان کے راستے سے ہٹ گئے ہیں، علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کو ہم اپنا بڑا لیڈر تو کہتے ہیں لیکن ان کے افکار و تعلیمات کی طرف ہم توجہ نہیں دے رہے، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کی جو تعلیمات تھیں، جو پاکستان کے بارے میں ان کے ارشادات تھے، جو انہوں نے پالیسی کے طور پر، اور جو انہوں نے اہداف کے طور پر باتیں بیان فرمائی تھیں، ان کو مشعلِ راہ بنایا جائے، اور ان کے لیے دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں، اور پاکستان کو ان کی امنگوں اور ان کی توضیحات کے مطابق ایک صحیح اسلامی ریاست کی شکل دیں۔

اسلام کی چھتری

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۹جون ۲۰۱۸ء)

......علامہ محمد اقبالؒ کے یہ ریمارکس کہیں پڑھے تھے کہ ''ہم نے اسلام کا تحفظ کبھی نہیں کیا بلکہ اسلام ہی ہمیشہ ہمارا تحفظ کرتا ہے''۔ بدقسمتی سے اقبالؒ کے تصور پر قائم ہونے والے پاکستان میں بھی تحریکِ پاکستان سے لے کر اب تک ہماری قومی نفسیات ور جحانات کا رخ اور سطح یہی چلی آرہی ہے۔ ہم سب کے ہاتھ میں ''اسلام'' ایک چھتری کی صورت میں ہر وقت موجود رہتا ہے، جہاں کہیں دھوپ یا بارش کی وجہ سے اس کی ضرورت پڑتی ہے ہم اسے اپنے سر پر تان لیتے ہیں اور جونہی وہ ضرورت ختم ہوجاتی ہے، یا خود ہمارا موڈ اس دھوپ یا بارش کو انجوائے کرنے کا بن جاتا ہے تو وہ چھتری خود بخود سمٹ کر پھر سے ہمارے ہاتھ کی چھڑی بن کر رہ جاتی ہے۔ ہمارا ایک اور ''طریق واردات'' بھی ہے کہ اسلام اور اسلامی تہذیب کی کوئی بات ہمیں اختیار کرنا پڑ جائے تو ہم سرے سے اس کو ہی شک و نزاع کا موضوع بنادیتے ہیں تاکہ ''نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری''۔......

علامہ محمد اقبالؒ کا ایک خطاب

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۸ جون ۲۰۱۹ء)

وفاقی وزیر سائنسی امور فواد چودھری صاحب کا کہنا ہے کہ پاکستان بنانے والے قائدین مذہبی لوگ نہیں تھے اور نہ ہی مذہبی راہنماؤں کا پاکستان بنانے میں کوئی کردار ہے۔ باقی تمام باتوں سے قطع نظر مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کا ایک خطاب پیش کیا جا رہا ہے جو انہوں نے ۹ فروری ۱۹۳۲ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں عیدالفطر کے اجتماع میں ارشاد فرمایا تھا اور انجمنِ اسلامیہ لاہور نے اسے چھپوا کر تقسیم کیا تھا۔ اس خطبہ کا متن عبدالواحد معینی اور عبداللہ قریشی کے مرتب کردہ ''مقالاتِ اقبالؒ'' سے لیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بانیانِ پاکستان کی مذہبیت اور تحریکِ پاکستان کے حوالے سے ان کے دینی مقاصد کا معیار اور دائرہ کیا تھا۔ خدا کرے کہ ہم علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کے خطبات و بیانات کو سنجیدگی کے ساتھ پڑھیں اور ان سے اپنی قومی پالیسیوں میں راہنمائی حاصل کرنے کی کوئی عملی سبیل پیدا کریں، آمین یارب العالمین۔

''قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اُترا۔ لوگوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں۔ تو تم میں جو کوئی یہ مہینہ پائے ضرور اس کے روزے رکھے۔''

یہی ارشادِ خداوندی ہے جس کی تعمیل میں آپ نے ماہِ رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھے اور اس اطاعتِ الٰہی کی توفیق پانے کی خوشی میں آج بحیثیت قوم خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجالانے کے لیے جمع ہوئے۔ بیشک مسلم کی عید اور اُس کی خوشی اگر کچھ ہے تو یہ کہ وہ اطاعتِ حق یعنی عبدیت کے فرائض کی بجاآوری میں پورا نکلے۔ اور قومیں بھی خوشی کے تیوہار مناتی ہیں مگر سوائے مسلمانوں کے اور کون سی قوم ہے جو خدائے پاک کی فرمانبرداری میں پورا اترنے کی عید مناتی ہو؟

مؤرخین کے بیان کے مطابق سنہ ۲ ہجری میں رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے، صدقہ عید الفطر کا حکم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سال جاری فرمایا، حضورؐ نے پہلے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے، پھر صدقہ کا حکم دیا، عید الفطر کی نماز باجماعت عید گاہ میں اسی سال ادا فرمائی، سنہ ۲ ہجری سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔

اسلام کے ارکان یعنی توحید، نماز، روزہ، حج، زکٰوۃ جب نبی اُمی کی زبانِ پاک سے خالقِ اکبر نے بندوں کی اصلاح و فلاح کے لیے ہدایت فرمائے تو مقصود یہ تھا کہ ان کی پابندی سے ''مسلم'' بحیثیت ''فرد'' وہ انسان بن سکے جسے وحی خداوندی ''احسن التقویم'' کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ اور ملّتِ اسلامیہ وہ ''ملّت'' بن جائے جو قرآن پاک کے الفاظ کے مطابق دنیا کی بہترین امت ہو اور اپنے تمام معاملات میں اعتدال اور میانہ روی کے اصول کو سامنے رکھنے والی ہو۔ اسلام کا ہر رکن انسانی زندگی کی صحیح نشوونما کے لیے اپنے اندر ہزارہا ظاہری اور باطنی مصلحتیں رکھتا ہے۔ مجھے اس وقت صرف اسی ایک رُکن کی حقیقت کے متعلق آپ سے دو ایک باتیں کہنی ہیں جسے ''صوم'' کہتے ہیں اور جس کی پابندی کی توفیق کے شکرانے میں آج آپ عید منا رہے ہیں۔ روزے پہلی اُمتوں پر بھی فرض تھے گو اُن کی تعداد وہ نہ ہو جو ہمارے روزوں کی ہے، اور فرض اس لیے قرار دیئے گئے کہ انسان پرہیزگاری کی راہ اختیار کرے۔

خدا نے فرمایا: ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے اگلوں پر فرض ہوئے تھے تاکہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔''

گویا روزہ انسان کو پرہیزگاری کی راہ پر چلاتا ہے، اس سے جسم اور جان دونوں تزکیہ پاتے ہیں۔ یہ خیال کہ روزہ ایک انفرادی عبادت ہے، صحیح نہیں بلکہ ظاہر و باطن کی صفائی کا یہ طریق، یہ ضبطِ نفس، یہ حیوانی خواہشوں کو اپنے بس میں رکھنے کا نظام اپنے اندر ملّت کی تمام اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کے مقاصد پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ فائدے جو ایک ''فرد'' کو روزہ رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں، اس صورت میں بھی ہو

سکتے تھے کہ روزے بجائے مسلسل ایک مہینہ رکھنے کے کبھی کبھی رکھ لیے جاتے، یا بجائے رمضان میں رکھنے کے سال کے اور مہینوں میں رکھ لیے جاتے۔ اگر محض فرد کی اصلاح اور اُس کی روحانی نشوونما پیشِ نظر ہوتی تو بیشک یہ ٹھیک تھا، لیکن فرد کے علاوہ تمام "ملّت" کے اقتصادی اور معاشرتی تزکیہ کی غرض بھی شارعِ برحق کے سامنے تھی۔

آج کی عید "عید الفطر" کہلاتی ہے، پیغمبرِ خدا نے جب عید کے لیے عید گاہ میں اکٹھا ہونے کا حکم دیا تو ساتھ ہی صدقہ عید الفطر ادا کرنے کا حکم بھی دیا۔ تعجب نہیں کہ عید کا دن مقرر کرنے کی اصل غرض ہی شارع علیہ الصلوٰۃ کے نزدیک صدقہ عید الفطر کا جاری کرنا ہو۔ حق یہ ہے کہ زکوٰۃ اور اصولِ تقسیمِ وراثت کے بعد تیسرا طریق اقتصادی اور معاشرتی مساوات قائم کرنے کا جو اسلام نے تجویز کیا "صدقات" کا تھا، اور ان صدقات میں سب سے بڑھ کر صدقہ فطر کا، اس لیے کہ یہ صدقہ ایک مقررہ دن پر تمام قوم کو ادا کرنا ہوتا ہے۔

رمضان کا مہینہ آپ نے اِس اہتمام سے بسر کیا ہے کہ کھانے پینے کے اوقات کی پابندی سیکھ لی، اپنی صحت درست کر لی، آئندہ گیارہ مہینے کئی بیماریوں سے محفوظ رہنے کے قابل اپنے آپ کو بنا لیا، کفایت شعاری سیکھی، رزق کی قدر و قیمت سیکھی۔ یہ سب ذاتی فائدے تھے۔ صیام کا قومی اور ملّی فائدہ یہ ہے کہ صاحبِ توفیق مسلمانوں کے دل میں اپنی قوم کے مفلس اور محروم افراد کی عملی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو اور صدقہ فطر ادا کرنے سے قوم میں ایک گونہ اقتصادی اور معاشرتی مساوات قائم ہو۔

حکم یہ ہے کہ عید کی نماز میں شرکت سے پہلے ہر صاحبِ توفیق مسلمان صدقہ فطر ادا کر کے عید گاہ میں آئے۔ اس سے مقصود یہ نہیں کہ اقتصادی اور معاشرتی مساوات صرف ایک آدھ دن کے لیے قائم ہو جائے، بلکہ ایک مہینہ کا متواتر ضبطِ نفس تم کو اِس لیے سکھایا گیا ہے کہ تم اس اقتصادی اور معاشرتی مساوات کو قائم رکھنے کی کوشش تمام سال کرتے رہو۔

باقی رہا یہ امر کہ روزے ماہِ رمضان کے ساتھ ہی کیوں مختص کیے جائیں۔ سو واضح

رہنا چاہیے کہ اسلام نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اسرار کو مدِ نظر رکھ کر "صیام" کے زمانی تسلسل کو ضروری سمجھا ہے۔ اس تسلسل کے لیے وقت کی تعیین لازم تھی اور چونکہ اسلام کا اصلی مقصود انسانوں کو احکامِ الٰہی کی فرمانبرداری میں پختہ کرنا تھا، اس لیے صیام کو اِس مہینہ کے ساتھ مختص کیا گیا جس میں احکامِ الٰہی کا نزول شروع ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ مسلمانوں کو ہر سال پورا مہینہ کامل تزکیہ نفس کے ساتھ نزولِ قرآنِ حکیم کی سالگرہ منانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ احکامِ الٰہی کی حرمت و تقدیس ہمیشہ مدِّ نظر رہے، اور نمازِ تراویح پر کاربند ہو کر قوم کے ہر فرد کو اجتماعی حیات کا قانون عملاً ازبر ہو جائے۔

اصل بات قوم کی اقتصادی اور تمدّنی زندگی کی مجموعی اصلاح کے متعلق تھی۔ قرآن میں جہاں مسائلِ "صیام" کے ذکر کے بعد یہ فرمایا کہ:

"یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جاؤ۔ اللہ یوں ہی بیان کرتا ہے لوگوں سے اپنی آیتیں کہ انہیں پرہیز گاری ملے۔"

وہاں ساتھ ہی ملحق بطور ان تمام کے نتیجہ کے یہ حکم بھی دیا:

"اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لیے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھا لو جان بوجھ کر۔"

روزہ رکھ کر مفلسوں سے محض ہمدردی کا احساس پیدا کر لینا کافی نہ تھا۔ عید کے دن غرباء کو دو چار دن کا کھانا دے دینا کافی نہ تھا۔ طریق وہ اختیار کرنا مقصود تھا جس سے مستقل طور پر دنیاوی مال و متاع سے انتفاع کے قواعد اِس طور پر قائم ہوں کہ جہاں تقسیمِ وراثت اور زکوٰۃ سے ملّتِ اسلامیہ کے مال و متاع میں ایک گونہ مساوات پیدا ہو، وہاں اس مساوات میں ایک دوسرے کے اموال میں ناجائز تصرّف سے کسی قسم کا خلل نہ آئے۔ روزوں کے التزام سے صرف انفرادی روحانیت کی ترقی یا زیادہ سے زیادہ انسانوں کے ساتھ ایک ہنگامی ہمدردی ہی مقصود نہیں بلکہ شارع کی نظر اِس بات پر ہے کہ تم اپنے اپنے حلال کے کمائے ہوئے مال پر قناعت کرو اور دوسروں کے کمائے

ہوئے مال کو باطل طریقوں سے کھانے کی کوشش نہ کرو۔ اس باطل طریق پر دوسروں کا مال کھانے کی بدترین روش قرآن کے نزدیک یہ ہے کہ مال و دولت کے ذریعے حکّام تک رسائی حاصل کی جائے اور ان کو رشوتوں سے اپنا طرفدار بناکر اوروں کے مالوں کو اپنے قبضہ میں لایا جائے۔ مذکورہ بالا آیت میں ''اثم'' کے معنی بعض مفسرین نے جھوٹی گواہی وغیرہ کے لیے ہیں، علمائے قرآن نے حکّام سے مراد مسلمانوں کے اپنے مفتی اور سلطان لیے ہیں۔ جب اپنے فقیہوں اور قاضیوں کے پاس جھوٹے مقدمے بنا کر لے جانے کو خدا نے مذموم قرار دیا ہو تو سمجھ لو کہ غیر اسلامی حکومتوں کے حکّام کے پاس اس قسم کے مقدمات لے جانا کس قدر ناجائز ہے۔

مہینہ بھر روزے رکھنے کی آخری غرض یہ تھی کہ آئندہ تمام سال اس طرح ایک دوسرے کے ہمدرد اور بھائی بن کر رہو کہ اگر اپنا مال ایک دوسرے کو بانٹ کر نہیں دے سکتے تو کم سے کم ''حکام'' کے پاس کوئی مالی مقدمہ اس قسم کا نہ لے کر جاؤ جس میں اُن کو رشوت دے کر حق و انصاف کے خلاف دوسروں کے مال پر قبضہ کرنا مقصود ہو۔ آج کے دن سے تمہارا عہد ہونا چاہیئے کہ قوم کی اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کی جو غرض قرآن حکیم نے اپنے ان احکام میں قرار دی ہے، اُس کو تم ہمیشہ مدّ نظر رکھو گے۔

مسلمانانِ پنجاب اس وقت تقریبًا سوا ارب روپے کے قرض میں مبتلا ہیں اور اس پر ہر سال تقریبًا چودہ کروڑ روپیہ سُود ادا کرتے ہیں۔ کیا اس قرض اور اس سود سے نجات کی کوئی سبیل سوائے اس کے ہے کہ تم احکامِ خداوندی کی طرف رجوع کرو، اور مالی اور اقتصادی غلامی سے اپنے آپ کو رہا کراؤ؟ تم اگر آج فضول خرچی چھوڑنے کے علاوہ مال اور جائیداد کے جھوٹے اور بلاضرورت مقدمے عدالتوں میں لے جانا چھوڑ دو تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ چند سال کے اندر تمہارے قرض کا کثیر حصہ از خود کم ہو جائے گا اور تم تھوڑی مدّت کے اندر قرض کی غلامی سے اپنے آپ کو آزاد کر لو گے۔ نہ صرف یہ کہ مالی مقدمات کا ترک تمہیں اِس قابل بنا دے گا کہ تم وہی روپیہ جو مقدموں اور رشوتوں اور وکیلوں کی فیسوں میں برباد کرتے ہو اسی سے اپنی تجارت اور اپنی صنعت کو

فروغ دے سکو گے۔

کیا اب بھی تم کو رجوع الی القرآن کی ضرورت محسوس نہ ہوگی اور تم عہد نہ کر لو گے کہ تمام دنیاوی امور میں شرعِ قرآنی کے پابند ہو جاؤ گے؟ کس انتباہ کے ساتھ رسولِ پاکؐ نے مسلمانوں کو پکار کر کہا تھا کہ: ''دیکھو قرض سے بچنا، قرض رات کا اندوہ اور دن کی خواری ہے۔''

اِس خطبے میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے صرف اقتصادی پہلو ہی پر نظر ڈالی گئی ہے، شاید عیدالاضحیٰ کے موقع پر اسی قسم کے ایک خطبے میں اسلامی زندگی کے ایک اور اہم پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ فی الحال میں حضورؐ سرورِ کائنات کی ایک حدیث پر اِس خطبے کو ختم کرتا ہوں جو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں رشد وہدایت کی تمام شاہ راہوں کو انسان پر کھول دیتی ہے:

''مجھے میرے رب نے نو (۹) باتوں کا حکم دیا ہے۔ ظاہر و باطن میں اخلاص پر کاربند رہنا۔ غضب و رضا دونوں حالتوں میں انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ فقر و تونگری میں میانہ روی۔ جو شخص مجھ پر زیادتی کرے اُس کو معاف کر دوں۔ جو مجھ سے قطعِ رحم کرے میں اُس سے صلہ رحم کروں۔ جو مجھے محروم کرے میں اُس کو اپنے پاس سے دُوں۔ میرا بولنا ذکرِ الٰہی کے لیے ہو۔ میری خاموشی غور و فکر کے لیے ہو، اور میرا دیکھنا عبرت کے لیے ہو۔''

اندلس کی تاریخ اور برصغیر کے دینی مدارس

(۱۳نومبر کو ۲۰۲۲ء کو مرکز عمر الفاروقؓ وڈالہ سندھواں ضلع سیالکوٹ میں
علماء کرام کے اجتماع سے خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ وڈالہ سندھواں کے ساتھ ہماری بہت یادیں وابستہ ہیں۔ ایک تو میری پیدائش سے بھی پہلے کی ہے کہ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ یہاں کی مرکزی مسجد میں کچھ عرصہ پڑھتے رہے ہیں، اس وجہ سے عقیدت ہے۔ نصف صدی پہلے کی بات ہے، میں یہاں بہت آیا کرتا تھا۔ یہاں مرکزی مسجد میں حضرت مولانا عبدالحقؒ ہوتے تھے، ہم سال میں ایک دو دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، یہ دوسری نسبت ہے۔ پھر حضرت مولانا احسان اللہ فاروقیؒ اس علاقے میں ہماری آواز اور دینی جدوجہد کی علامت و عنوان تھے، زندگی بھر انہوں نے دینی تعلیم اور دینی تحریکات کو فروغ دینے اور حمیت و غیرت کو بیدار کرنے کے لیے محنت کی ہے، ہمارا ان کے پاس بھی آنا جانا رہتا تھا۔ میں ان کے فرزند عزیزم حافظ حبیب اللہ فاروقی اور ان کے رفقاء کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس محفل کا اہتمام کیا اور آپ کے ساتھ مل بیٹھنے اور کچھ کہنے سننے کا موقع فراہم کیا۔ اللہ رب العزت ہماری حاضری قبول فرمائیں۔ دو تین باتیں عرض کروں گا۔ ابھی ہمارے معروف خطیب مولانا شبیر احمد عثمانی گفتگو فرماتے ہوئے تاریخ کا حوالہ دے رہے تھے۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں اس لیے دو باتیں تاریخ کے حوالے سے کروں گا۔

دینی درس گاہ کیا ہے؟ علامہ محمد اقبالؒ ہمارے ملک وقوم کے صفِ اول اور چوٹی کے رہنماؤں میں سے تھے، اللہ رب العزت نے ان کو بہت عظمت دی اور ان سے بہت کام لیا۔ تاریخ کے طالب علم کے طور پر عرض کیا کرتا ہوں کہ ہماری نئی پود اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو دین اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عشق کے ساتھ وابستہ رکھنے میں جتنا کام علامہ محمد اقبالؒ نے کیا ہے شاید کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ نئی نسل کی ذہنی آبیاری، عقیدۂ ختمِ نبوت کے ساتھ وابستہ رکھنے اور دین کی بنیادوں پر مستحکم کرنے میں بہت سے لوگوں کے کام ہیں، لیکن علامہ محمد اقبالؒ اور مولانا ظفر علی خانؒ کا

سب سے اہم کردار ہے، اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

علامہ اقبال مرحوم نے اپنی یادداشتوں میں اندلس کے حوالے سے لکھا ہے۔ اندلس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی۔ جبکہ یہاں متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں نے ایک ہزار سال کے لگ بھگ حکومت کی ہے مغلوں کے دور میں، تغلق، سوری اور غزنوی کے دور میں۔ لیکن جب مسلمانوں نے اندلس میں فوجی شکست کھائی، اس کے بعد وہاں آج مسلمان نظر نہیں آتے۔ وہاں آپ کو فاطمہ اسٹریٹ تو ملے گی لیکن فاطمہ نہیں ملے گی، علی روڈ تو ملے گا لیکن علی نہیں ملے گا، فاروق پارک ملے گا لیکن کوئی فاروق نہیں ملے گا۔ وہاں یہ تبدیلی آئی کہ مسجدیں ویران ہیں، محلوں میں نام پرانے ہیں لیکن بندہ کوئی نہیں ہے۔ وہاں آٹھ سو سال حکومت کے بعد یہ تبدیلی آگئی کہ جب مسلمان وہاں سے گئے تو بالکل آؤٹ ہو گئے۔

یہاں پاک وہند میں مسلمانوں نے ہزار سال کے لگ بھگ حکومت کی ہے لیکن جب گئے تو کیا آؤٹ ہو گئے ہیں یا ابھی موجود ہیں؟ میرے خیال میں پہلے سے بہتر پوزیشن میں موجود ہیں۔ ۱۷۵۷ء میں یہاں انگریز گھسا تھا اور ۱۸۵۷ء میں پورا کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ اڑھائی سو سال ہو گئے ہیں، آج نتیجہ دیکھیں کہ یہاں مسلمان ہیں یا نہیں ہیں؟ انڈیا میں ہم سے زیادہ مسلمان ہیں، بنگلہ دیش اور برما میں مسلمان ہیں، پورے خطے میں مسلمانوں کی تعداد پہلے سے تین گنا زیادہ ہے۔ کیا مدارس بند ہو گئے ہیں یا پہلے سے زیادہ ہوئے ہیں؟ دین کے ساتھ تعلق کم ہوا ہے یا بڑھا ہے؟ جب اقبال اندلس گئے اور اسپین کو دیکھ کر آئے تو انہوں نے ایک جملہ کہا تھا، وہ جملہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ دینی مدرسے جس طرح کام کر رہے ہیں ان کو اسی طرح کام کرنے دو، ان کو نہ چھیڑو، یہ مدرسہ نہ رہا تو نتیجہ وہی ہو گا جو میں اسپین میں دیکھ کر آیا ہوں۔ اس لیے میری قوم سے اپیل ہے کہ مدرسے کو اسی حالت میں رہنے دو اس کو ایسے ہی کام کرنے دو ورنہ نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔

آج کے دور میں دنیا میں جو کشمکش ہے۔ ایک کشمکش تو مذاہب کے درمیان ہے اور ایک بڑی کشمکش بلیورز اور نان بلیورز (خدا اور آخرت کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں) کے درمیان ہے کہ خدا ہے یا نہیں ہے؟ رسول کی ضرورت تھی یا نہیں تھی؟ قبر حشر ہے یا نہیں ہے؟ یہ ذہن اور عقیدہ اگرچہ بہت پرانا ہے لیکن اب یہ زیادہ پھیل رہا ہے۔ آپ کی یونیورسٹیوں میں آگیا ہے اور دنیا بھر میں نئی پود میں یہ

پھیل رہا ہے۔ اس کشمکش میں ایک ہمارا معیار ہے اور ایک مغرب کا معیار ہے۔ یہ واضح فرق ذہن میں رکھ لیں کہ خدا، رسول، قرآن، قیامت، قبر، حشر، جنت، دوزخ کی بات کرنے اور کمٹمنٹ رکھنے کو مغرب دقیانوسیت، قوم کو گمراہ کرنے، اور شر پیدا کرنے والی بات کہتا ہے۔ جبکہ ہمارے نزدیک خدائی تعلیمات، قرآن و سنت اور انبیاءؑ کی تعلیمات سے انحراف اور اپنی خواہشات پر عمل کرنا شر اور گمراہی ہے۔ مغرب کہتا ہے کہ ہم آزاد ہیں اور اپنی مرضی سے فیصلے کریں گے، کسی کی ڈکٹیشن قبول نہیں کریں گے۔

''دی انڈیپنڈنٹ'' برطانیہ کا بڑا اخبار ہے جو دنیا کے بڑے اخباروں میں شامل ہے، لندن سے چھپتا ہے۔ پندرہ بیس سال پہلے کی بات ہے، میں ان دنوں لندن میں تھا، برمنگھم میں سالانہ عالمی ختمِ نبوت کانفرنس ہو رہی تھی۔ عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے زیر اہتمام سالانہ عالمی ختمِ نبوت کانفرنس اب بھی ہوتی ہے۔ میں کم و بیش بیس پچیس سال مسلسل اس میں جاتا رہا ہوں۔ کانفرنس سے کچھ دن پہلے دی انڈیپنڈنٹ نے ایک رپورٹ چھاپی کہ دنیا میں شر کے مراکز اور سر چشمے کون سے ہیں؟ پوری تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا، رسول، قیامت، جنت، دوزخ، مابعد الموت زندگی کا تصور شر ہے اور دنیا میں یہ شر جنوبی ایشیا کے دینی مدارس پھیلا رہے ہیں۔ دنیا میں جہاں بھی کوئی ایسا مرکز ہے جہاں یہ باتیں ہوتی ہیں تو وہاں جنوبی ایشیا کے دینی مدارس کا تعلیم یافتہ یا اُن کا کوئی شاگرد بیٹھا ہوا ہے۔ یہ قرآن و سنت، شریعت، قبر حشر کی باتیں کرتے ہیں۔ اس رپورٹ میں یہ لکھا تھا کہ شر کے ان مراکز کے دو ہیڈ کوارٹر ہیں۔ پورے صفحے کی رپورٹ میں پیشانی پر ان دونوں جگہوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک بستی نظام الدین کے تبلیغی مرکز کی تصویر، اور دوسری دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث کی تصویر۔

جب وہ رپورٹ چھپی، اتفاق کی بات ہے کہ اس کے چند دن بعد برمنگھم میں ختمِ نبوت کانفرنس تھی۔ تین چار مقررین نے بازو چڑھا کر اس کے خلاف تقریر کی کہ تم نے یہ کہا، کیوں کہا؟ تم نے ان کو شر کے سر چشمے کیوں قرار دیا؟ اتفاق سے اس کے بعد میری باری آ گئی تو میں نے کہا میں دی انڈیپنڈنٹ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ تمہاری بڑی مہربانی اور شکریہ، تم نے بہت اچھا کیا۔ مجھے تمہاری رپورٹ سے اتفاق ہے کہ جس کو تم شر کہتے ہو اس کے دو سر چشمے ہیں، لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ ایک مینوفیکچرر ہے یعنی دارالعلوم دیوبند، اور دوسرا ڈسٹری بیوٹر ہے یعنی بستی نظام الدین جو کہ پوری دنیا کو ڈسٹری بیوٹ

کر رہا ہے۔ میں نے کہا میں تم سے بالکل اتفاق کرتا ہوں، تم نے بالکل ٹھیک تجزیہ کیا ہے، میں تمہارا اس بات پر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے دنیا پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ تمہاری لڑائی کس سے ہے اور تمہارے راستے میں رکاوٹ کون ہے؟ تم جو دنیا بھر میں دہریت، خدا کا انکار، خدا کی نافرمانی اور آسمانی تعلیمات سے انحراف کی اپنی تہذیب لانا چاہتے ہو، تم نے دنیا کو بتا دیا ہے کہ تمہارے راستے میں رکاوٹ کون ہے؟ میں اس کی نشاندہی پر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مدرسہ کیا ہے؟ علامہ اقبالؒ کی زبان میں یہ وہ درسگاہ ہے کہ جس کے بغیر ہندوستان کا حال بھی اسپین والا ہو جائے گا، اور دی انڈیپنڈنٹ کی زبان میں مدرسہ آج کی تہذیبی یلغار کے مقابلے میں ناقابلِ تسخیر مورچہ ہے۔ آج کی فکری، تہذیبی، اعتقادی اور فلسفے کی جنگ کے مقابلے میں وہ مورچہ جسے آج تک فتح نہیں کیا جاسکا اور ان شاءاللہ قیامت تک فتح نہیں کیا جاسکے گا، اللہ تعالی اس مورچے کو قائم رکھیں، آمین......

تحریکِ آزادی کے راہنماؤں کی جدوجہد

(۲۳نومبر ۲۰۲۲ء کو قائداعظم ایجوکیشنل کمپلیکس ساہیوال میں خطاب سے اقتباس)

......برصغیر کے برطانوی قبضہ میں آجانے کے بعد پیش آنے والے مسائل کے حوالے سے سر سیّد احمد خان، جسٹس امیر علی، علامہ محمد اقبال اور قائداعظم رحمہم اللہ تعالیٰ کا ایک فکری، نظریاتی اور تہذیبی کیمپ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج ہم پھر استعماری قبضے میں ہیں۔ اُس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں تھے، آج آئی ایم ایف وغیرہ کے قبضے میں ہیں۔ شاہ عالم ثانی کا وائسرائے ہند کے ساتھ معاہدہ پڑھ لیں جس کے نتیجے میں دہلی کا مالیاتی کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنبھال لیا تھا، اور ہمارا آئی ایم ایف سے معاہدہ پڑھ لیں، ان میں بہت تھوڑا ہی فرق ہو گا۔

ان معاملات کو حل کرنے کے لیے ہمارے کیمپ نے تو مقابلہ کیا تھا اور مسلح وغیر مسلح لڑائیاں لڑیں، سڑکوں پر آئے، جلوس نکالے، جیلیں کاٹیں۔ شہدائے بالاکوٹ کی تاریخ کو لے لیں اور تحریکِ خلافت کو لے لیں، دونوں محاذوں پر کھڑے تھے، ہمارا تو مقابلے کا محاذ تھا۔ لیکن دوسری طرف سر سیّد کا کیمپ تھا۔ میں اسے یوں تعبیر کرتا ہوں کہ ہم تو یہ کہتے تھے کہ ہم سے چھین لیا گیا ہے اس لیے ہم نے واپس چھیننا ہے، جبکہ یہ لوگ کہتے تھے کہ جتنا بچا سکتے ہو بچا لو اور وہ کچھ نہ کچھ بچانے میں کامیاب رہے۔

اس تمہید کے ساتھ ایک بات اور کہہ کر اپنے موضوع کی طرف آؤں گا۔ میں جہاں اس بات پر خوشی کا اظہار کر رہا ہوں کہ قائداعظم کے نام پر یہ ادارہ کام کر رہا ہے، اور علامہ اقبال کے نام پر بھی بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں، تو میں اساتذہ اور طلباء سے یہ کہنا چاہوں گا کہ ہم قائداعظم، علامہ اقبال، سر سیّد اور جسٹس امیر علی کے ساتھ صرف تعلق کا اظہار نہ کریں بلکہ ان کو اسٹڈی بھی کرنا چاہیے کہ انہوں نے کیا کیا تھا، کیسے کیا تھا، ان کا رخ کیا تھا، انداز کیا تھا اور ان کی جدوجہد کے نتائج کیا تھے؟......

مسلم تہذیب وثقافت کو بحال کرنے کا مقصد

(۳ستمبر ۲۰۲۳ء کو مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ میں خطاب سے اقتباس)

......دوسری بات بالخصوص پڑھے لکھے نوجوانوں سے کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے بھارت سے علیحدگی کس عنوان کے ساتھ حاصل کی تھی۔ ہم نے کہا تھا کہ ہندوؤں کی تہذیب الگ ہے، ہماری تہذیب الگ ہے، اس لیے ہم گڈمڈ نہیں رہ سکتے۔ سر سید احمد خان مرحوم نے بھی تہذیب کو عنوان بنایا تھا اور بعد میں علامہ محمد اقبال اور قائداعظم رحمہم اللہ نے بھی تہذیب کو عنوان بنا کر علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا کہ ہم ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے نہیں رہ سکتے، اور کوشش کر کے ہم الگ ہوئے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہم نے ہندوانہ تہذیب سے کٹنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کا مقصد انگریزی تہذیب میں ضم ہونا تھا یا ہم مسلم تہذیب وثقافت کو بحال کرنے کے لیے علیحدہ ہوئے تھے؟

ہم اس وقت کیا کر رہے ہیں؟ پاکستان کے مقصد قیام کے حوالے سے یہ بہت بڑا سوال ہے کہ ہم ہندوؤں کی تہذیب سے تو الگ ہوئے لیکن مغربی تہذیب میں گھستے جا رہے ہیں۔ ہماری نوجوان نسل کی سوچ اور فکر کو ویسٹرنائزیشن کا شکار کیا جا رہا ہے، ہمیں اس حوالے سے غور کرنا چاہیے کہ مسلم تہذیب سے بہتر کون سی تہذیب ہو سکتی ہے، ہماری ثقافت سے بڑی ثقافت کس کی ہے؟ ہم نے دنیا پر ہزار بارہ سو سال حکومت کی ہے اور دنیا کو پتہ ہے کہ ہماری تہذیب کیا ہے۔......

متفرق تذکار

اسلام اور جمہوریت کے بارے میں علامہ اقبالؒ کا کلام

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۱۲ستمبر ۱۹۸۶ء)

......نواں اعتراض یہ ہے کہ شریعت بل کے ذریعے وفاقی شرعی عدالت کو ہر معاملہ میں آخری اتھارٹی دے کا درجہ کر جمہوری اداروں کی آزادانہ حیثیت اور رائے عامہ کی آزادی کو ختم کر دیا گیا ہے جس سے جمہوری اَقدار مجروح ہوں گی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ جمہوریت کا جو تصور مغرب اور یورپ کا ہے وہ نہ تو مکمل طور پر اسلام سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی پاکستان جیسی نظریاتی ریاست میں اس کی گنجائش ہے۔ مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال مرحوم کے کلام میں اس فرق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جو اسلام اور جمہوریت میں ہے۔ عوام کے حقوق، آزادئ رائے، حکومت پر تنقید کا حق، اور دیگر بنیادی حقوق کو اسلام نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ ان کی ضمانت دیتا ہے، لیکن قرآن وسنت کے منصوص مسائل میں رائے اور فیصلہ کا اختیار نہ جمہوری اداروں کو ہے اور نہ ہی ایسا کوئی حق رائے عامہ کو حاصل ہے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے واضح طور پر ارشاد فرمادیا ہے کہ

> ”کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو وہ اس بارے میں اپنی رائے اختیار کریں۔“ (الاحزاب)

جمہوری اداروں اور رائے عامہ کے تمام تر احترام کے باوجود انہیں یہ حق کسی صورت میں نہیں دیا جا سکتا کہ وہ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کا جو راستہ چاہیں اختیار کر لیں۔ اس کے لیے وہی لوگ اتھارٹی ہیں جو قرآن وسنت اور دیگر ضروری علوم سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں اور آج کے دور میں اس کے ضروری تقاضوں کو جسٹس صاحبان اور جید علماء کرام پر مشتمل مشترکہ وفاقی شرعی عدالت ہی کے ذریعے پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں شریعت بل میں جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے وہ اسلامی جمہوریت کے موجودہ تقاضوں کی روشنی میں بالکل صحیح اور منطقی راستہ ہے۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

(۱۸ مارچ ۱۹۹۰ء کو الشبان المسلمون سیالکوٹ کے زیر اہتمام سیالکوٹ میں خطاب سے اقتباس)

......علامہ عثمانیؒ کی علمی عظمت کے اعتراف کی ایک جھلک اس واقعہ کے حوالہ سے دیکھی جا سکتی ہے جو میں نے حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی زبانی سنا۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے ایک دور میں شیرانوالہ لاہور میں اکابر علماء دیوبند کے اجتماع کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر حضرت مولانا حسین علیؒ آف واں بھچراں اور حضرت دین پوریؒ جیسے عظیم اکابر بھی موجود تھے اور شیخ اسلام علامہ شبیر احمدؒ عثمانی بھی تشریف فرما تھے۔ اجتماع میں لاہور کے سرکردہ حضرات کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن میں سرِ فہرست علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم تھے۔ اس اجتماع میں جب حضرت علامہ شبیر احمدؒ عثمانی نے خطاب شروع کیا تو علامہ اقبالؒ سٹیج پر تشریف فرما تھے لیکن چند لمحوں کے بعد وہ سٹیج سے اٹھ کر یہ کہتے ہوئے سامعین میں بیٹھ گئے کہ اس پیکرِ علم کا خطاب سامنے بیٹھ کر طالب علموں کی طرح سننا چاہیے۔ یہ علامہ عثمانیؒ کی علمی عظمت کا اعتراف ہے اور اس سے ان کے علمی مقام و مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔......

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۷ء)

......علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا شمار اپنے دور کے چند گنے چنے خطباء اور متکلّمین میں ہوتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق انجمن خدام الدین لاہور کے بانی حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی دعوت پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ شیرانوالہ گیٹ لاہور میں علماء اور اربابِ دانش کی ایک مجلس سے خطاب کر رہے تھے، اس مجلس میں مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ بھی موجود تھے جو سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ علامہ عثمانیؒ کے خطاب کو چند لمحے گزرے تو علامہ اقبالؒ سٹیج سے اٹھ کر یہ کہتے ہوئے سامنے آکر بیٹھ گئے کہ ان جیسے فاضل علماء کا خطاب تو سامنے بیٹھ کر سننا چاہیے۔ اس واقعہ سے علامہ عثمانیؒ کے علم و فضل کے ساتھ ساتھ علامہ محمد اقبالؒ کی علم دوستی اور علماء حق سے محبت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔......

کروڑوں ”ڈیانائیں“

(روزنامہ پاکستان، لاہور- ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۷ء)

...... یہ داستان صرف لیڈی ڈیانا کی نہیں ہے، اسے تو عالمی پریس تک رسائی حاصل تھی اس لیے اس کی داستان لوگوں تک پہنچ گئی، لیکن وہ کروڑوں ”ڈیانائیں“ اور ”چارلس“ جو اسی کرب کی بھٹی میں جل رہے ہیں، اور جن کے انسانی جذبات واحساسات کو خاندانی نظام کی تباہی نے کچل کر رکھ دیا ہے، مگر وہ اپنے درد کے اظہار کی کوئی راہ نہیں پا رہے۔ لیڈی ڈیانا نے اپنی ذات کی قربانی دے کر اس لاوے کو پھٹنے کی راہ دے دی ہے، اور جس مرد یا عورت نے بھی ڈیانا کو اپنے جذبات اور دلی کیفیات کی ترجمانی کرتے پایا ہے وہ اپنے احساسات کی اس ترجمانی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے گھر سے باہر نکل آیا ہے۔

لیڈی ڈیانا صرف مغربی ثقافت کی علامت نہیں، بلکہ اس ثقافت کے ہاتھوں کچلے جانے والے انسانی جذبات واحساسات کی ترجمان بھی تھی، اور اسی ثقافت کی تباہ کاریوں کے خلاف بغاوت کا پرچم اٹھائے ہوئے تھی۔ اس کی موت پر آخری رسوم کے لیے لندن میں جمع ہونے والی ریکارڈ تعداد مغربی تہذیب وثقافت کے اس منطقی انجام کے قریب آنے کی بھی خبر دے رہی ہے جس کے بارے میں مفکر پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے پون صدی پہلے کہہ دیا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

کامریڈ، الہلال، زمیندار اور چٹان

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ یکم اکتوبر ۱۹۹۹ء)

...... مولانا محمد علی جوہرؒ کا ''کامریڈ'' اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ''الہلال'' ایک دور میں ہماری ملی امنگوں اور جذبات کی علامت ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں ملی حمیت کا جذبہ بیدار رکھنے اور انہیں عالمی استعمار کی سازشوں سے خبردار کرنے میں جو کردار ادا کیا وہ تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ انہوں نے ملتِ اسلامیہ کو داخلی محاذ پر درپیش فتنوں کی طرف رخ نہیں کیا اور اپنی تمام تر توجہ خارجی محاذ پر مرکوز رکھی۔ مگر مولانا ظفر علی خانؒ اور شورش کاشمیریؒ نے داخلی محاذ پر بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ قادیانیت کے فتنہ کو بے نقاب کرنے میں ''زمیندار'' اور ''چٹان'' کی خدمات سے کون ناواقف ہے؟ اور پھر آغا شورش کاشمیری مرحوم کی یہ جدوجہد ہماری فکری تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ انہوں نے علامہ محمد اقبالؒ کے فکر وفلسفہ کو دین بے زار دانشوروں کا یرغمال بننے سے بچایا اور تحریکِ آزادی کے مجاہدین کی کردار کشی کرنے والوں کے سامنے خود ڈھال بن کر کھڑے ہوگئے۔......

فرزندِ اقبال کا دورۂ افغانستان

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ مئی ۲۰۰۰ء)

مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے فرزند اور لاہور ہائیکورٹ کے سابق چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے گزشتہ دنوں افغانستان کا دورہ کیا ہے اور واپسی پر لاہور میں ایک تقریب کے دوران اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انہوں نے افغانستان کے انقلاب کو ایک کامیاب اسلامی انقلاب قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح طالبان نے افغانستان میں امن قائم کیا ہے وہ اس دور میں اور کوئی نہیں کر سکا اور یہ اسلامی احکام کے نفاذ کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالبان اسلام اور پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں اس لیے ہمیں مغرب کے دباؤ کے تحت طالبان کو ناراض نہیں کرنا چاہیے اور ان سے ہر ممکن تعاون کرنا چاہیے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۴ اپریل ۲۰۰۰ء کے مطابق ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ افغان خواتین کے بارے میں مغرب منفی پراپیگنڈا کر رہا ہے، اور طالبان ہماری جنگ لڑ رہے ہیں جس کا ہمیں احساس تک نہیں۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت ہمارے مفاد میں نہیں ہے اور ہم نے مغرب کے کہنے پر طالبان کا ساتھ چھوڑا تو ہمیں شدید نقصان ہوگا۔

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کا شمار ہمارے ملک کے لبرل دانشوروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ہمیشہ علماء کے طبقہ کی مخالفت کی ہے، اور اجتہاد کے نام پر اسلامی احکام وقوانین کی جدید تعبیر وتشریح کی بات کی ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر جاوید اقبال ترکی کی ان اصلاحات کی بھی حمایت کرتے رہے ہیں جن کے تحت مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافتِ عثمانیہ اور اس کے ساتھ اسلامی قوانین کے پورے نظام کو ترکی سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب موصوف کا دورہ افغانستان اور ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر ان کی طرف سے طالبان کی حکومت کی حمایت کا یہ رجحان بلاشبہ حالات میں بہت بڑی تبدیلی کی غمازی کرتا ہے، اور طالبان کی اسلامی حکومت کی مخلصانہ پالیسیوں کی شہادت دیتا ہے۔

اس لیے ہم ملک کے دیگر دانشوروں سے بھی یہی گزارش کریں گے کہ وہ مغربی میڈیا کے

پروپیگنڈا پر انحصار کرنے کی بجائے خود افغانستان جا کر حالات اور حقائق کا مشاہدہ کریں اور اپنے مظلوم اور غیور افغان مسلم بھائیوں کو اس مشکل اور نازک مرحلہ سے وقار اور کامیابی کے ساتھ باہر نکالنے میں ان سے عملی تعاون کی کوئی صورت نکالیں۔

”فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے“

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔۱۵ نومبر ۲۰۰۰ء)

......مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے انگریزوں کے حوالہ سے کہا تھا کہ

ع فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

امریکہ بھی فرنگی استعمار ہی کا جانشین ہے اور اس کی رگِ جاں بھی یہود کے قبضے میں ہے۔ اور اس بات میں اب کوئی شبہ اور ابہام باقی نہیں رہ گیا کہ امریکہ اور مغربی ممالک کی سیاست و معیشت اور میڈیا مکمل طور پر یہود کے کنٹرول میں ہے اور وہ اپنی اس معمولی سی اقلیت کو کسی حالت میں ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی مکمل پشت پناہی اور امریکی رہنماؤں کا اسرائیلی مظالم کی ظاہری مذمت تک کو برداشت نہ کرنا اسی یہودی کنٹرول کا شاخسانہ ہے۔ اور امریکی خاتونِ اول کی طرف سے انتخابی فنڈ کے لیے مسلمانوں کے عطیات واپس کرنے کا اعلان بھی انہی یہودیوں کو خوش کرنے کی کوشش تھی۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کو مسز ہیلری کلنٹن کا یہ فیصلہ اچھا نہ لگا ہو اور اس میں انہیں پریشانی کا کوئی پہلو نظر آرہا ہو مگر ہمیں تو اس بات پر خوشی ہوئی ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ ہمارے چند امریکی مسلمان بھائیوں کے پیسے بچ گئے جو انہوں نے سیاسی مصلحت کی وجہ سے مسز ہیلری کے انتخابی فنڈ میں دیے ہوں گے، کیونکہ امریکی خاتونِ اول کی کھلم کھلا یہود نوازی کے باعث ان کے منتخب ہونے کے بعد ان پیسوں کا مفاد یہودیوں کے حق میں جانا واضح تھا۔ یقیناً اس رقم میں کچھ نیک مسلمان کے پیسے بھی ہوں گے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پیسوں کو یہودیوں کے حق میں استعمال ہونے سے بچا لیا ہے۔

اور اس وجہ سے بھی ہیلری کلنٹن کا یہ فیصلہ ہمارے لیے اطمینان کا باعث بنا ہے کہ امریکیوں کو کسی کے پیسے واپس کرنے کا خیال تو آیا، ورنہ امریکیوں کی تجوریوں میں تو دنیا بھر کی لوٹ مار اور معاشی ڈکیتیوں کی رقمیں بھری پڑی ہیں۔ اور اس میں ہم غریب پاکستانیوں کے ایف سولہ جنگی طیاروں کی خریداری کے لیے دیے ہوئے کچھ روپے بھی شامل ہیں۔

اس لیے ہم امریکی خاتون اول کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان سے گزارش کرتے ہیں کہ اگر انہیں یہودیوں کی حمایت میں مسلمانوں کے خلاف اس درجہ غیرت آگئی ہے کہ وہ اس غصہ میں مسلمانوں کی رقمیں واپس کر رہی ہیں تو لگے ہاتھوں ہم سے لوٹی ہوئی رقمیں بھی واپس کر دیں، اور تیسری دنیا کے ممالک کی سود در سود کی ظالمانہ رقوم کے ساتھ ساتھ عربوں کے تیل اور پاکستان کے ایف سولہ کی رقوم بھی اسی غصہ میں ہمیں لوٹا دیں۔

قومیت کی بنیاد کس پر؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۳ اپریل ۲۰۰۱ء)

...... مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے مباحثہ کا بعض مضامین میں ذکر کیا گیا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا تھا کہ قوم وطن کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے جس پر علامہ اقبالؒ نے یہ کہہ کر اعتراض کیا تھا کہ قومیت کی بنیاد وطن پر نہیں بلکہ مذہب پر ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد علامہ اقبالؒ کے اشعار اور مولانا مدنیؒ کے ساتھ ان کی بالواسطہ مراسلت کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ روایت اب بھی موجود ہے اور کچھ مضامین میں اس کا ذکر کیا گیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بحث بے مقصد اور فضول ہو چکی ہے اس لیے کہ علامہ محمد اقبالؒ کے فلسفہ پر جو ملک ایک اسلامی ریاست کے طور پر پاکستان کے نام پر نصف صدی قبل وجود میں آیا تھا اس میں قومیت کے حوالہ سے علامہ اقبالؒ کے فکر و فلسفہ کی بجائے عملی طور پر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بیان کردہ فلسفہ کو اپنایا گیا ہے۔ پاکستان کے جغرافیہ اور وطن کی حدود میں رہنے والے تمام افراد خواہ وہ مسلمان ہوں، سکھ ہوں، ہندو ہوں، عیسائی ہوں، پارسی ہوں، قادیانی ہوں یا بہائی ہوں، سب قومیت کے حوالہ سے ''پاکستانی'' کہلاتے ہیں اور پاسپورٹ سمیت تمام سرکاری دستاویزات میں ان کو پاکستانی لکھا جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس مشترکہ قومیت کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ وطن ہے اور یہ وہی ''متحدہ قومیت'' ہے جس کی طرف مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ارشاد کیا تھا۔ اس لیے میرے خیال میں اب اس بے مقصد بحث میں الجھنا محض وقت ضائع کرنا ہے۔......

خلافت کی قبا

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد-۲۴ مارچ ۲۰۰۳ء)

......امریکہ کا اصل ایجنڈا اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی کہ مشرقِ وسطیٰ کے وسائل و ذخائر پر قبضہ کرنے، اور اس خطہ میں مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی بالادستی ختم کرنے کے لیے اب سے ایک صدی قبل جس ایجنڈے کا آغاز برطانیہ نے کیا تھا، یہ اسی مہم کا تیسرا راؤنڈ ہے۔ اس مہم کا آغاز خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کی سازشوں سے ہوا تھا، اور مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کو ختم کرنے کے لیے برطانیہ نے خود ترکی کو اس طرح خلافت کے خلاف تیار کیا کہ بقول اقبالؒ

ع چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا

خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ اور مشرقِ وسطیٰ کے جغرافیہ کی تبدیلی اس پروگرام کا پہلا راؤنڈ تھی جس کے تحت پرانے نقشے کو یکسر تبدیل کر کے درجنوں نئی ریاستوں کو وجود میں لایا گیا۔ اس کے بعد فلسطین میں یہودیوں کو دنیا کے مختلف کونوں سے لا کر آباد کرنا اور اسرائیلی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کرنا اس پروگرام کا دوسرا راؤنڈ تھا جس پر پون صدی صرف ہوگئی۔ اسرائیل کا قیام، اس کی سرحدوں میں مرحلہ وار توسیع اور اس کے استحکام کے لیے امریکہ اور دیگر مغربی ملکوں کا کردار سب پر واضح ہے۔ اسے اس خطہ کی واحد اور بالاتر عسکری قوت بنانے کے لیے اس پون صدی کے دوران کیا کچھ نہیں کیا گیا اور اب کیا کچھ نہیں کیا جا رہا......

آسٹریلیا مسجد لاہور

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۱ جنوری ۲۰۱۰ء)

...... پیر کو سارا دن جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے امتحان میں مصروف رہنے کے بعد نمازِ عشاء سے قبل لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے آسٹریلیا مسجد پہنچ گیا جہاں عشاء کے بعد "تحریکِ پاکستان میں علماء دیوبند کا کردار" کے موضوع پر مجھے خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔ اس مسجد کی ایک مستقل تاریخ ہے، یہ مسجد آسٹریلیا میں رہنے والے لاہور کے ایک تاجر بزرگ حاجی محمد بخشؒ نے علامہ محمد اقبالؒ کے کہنے پر بنائی تھی۔ اور علامہ اقبال مرحوم کا پروگرام تھا کہ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ لاہور تشریف لے آئیں اور وہ دونوں مل کر فقہِ اسلامی پر اسی طرز کا کام کریں جیسا کہ اورنگزیب عالمگیرؒ کے دور میں فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں ہوا تھا۔

اس مرکز کے لیے آسٹریلیا مسجد کے عقب میں ایک الگ عمارت بھی تعمیر کی گئی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ ڈابھیل جانے سے پہلے لاہور تشریف لائے اور ایک ماہ تک اس مسجد کے خطیب کی حیثیت سے رہے مگر اس پر شرحِ صدر نہ ہوا اور وہ ڈابھیل تشریف لے گئے، جبکہ ان کی جگہ ان کے خاص شاگرد حضرت مولانا عبد الحنان ہزارویؒ اس مسجد کے ایک عرصہ تک خطیب رہے۔

یہ مسجد محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے اور ہمارے محترم دوست مولانا عبد الرؤف ملک نے کم بیش ربع صدی تک اس مسجد میں خطابت کے فرائض سرانجام دیے ہیں۔ مولانا عبد الرؤف ملک جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے ابتدائی فضلاء میں سے ہیں اور متحدہ علماء کونسل کے سیکرٹری جنرل چلے آرہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے نام سے دینی تعلیم کی ایک درسگاہ کچھ عرصہ سے یہاں کام کر رہی ہے اور درسِ نظامی کی تعلیم ہوتی ہے۔......

اردو کے پیپر میں ایک افسوسناک سوال

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ مارچ ۲۰۱۴ء)

گریڈ ۸ کے ۲۰۱۴ء کے امتحانات میں ’’اردو‘‘ کا پرچہ اس وقت ہمارے سامنے ہے جس کے ایک سوال کی طرف ہم حکومت اور قارئین کو توجہ دلانا چاہتے ہیں... ہم نے پورا سوال اس لیے جوں کا توں نقل کر دیا ہے تاکہ اس چابکدستی کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکے جس کا مظاہرہ سوال مرتب کرنے والے ممتحن نے کیا ہے۔ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کا یہ واقعہ تاریخِ اسلامی کا مشہور واقعہ ہے اور واقعہ کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس سوال پر جواب دیا کہ میں نے بھی اتنا ہی کپڑا لیا ہے جتنا دوسروں کو دیا ہے، میرا کُرتا لمبا اس لیے ہے کہ میرے بیٹے کے حصے کا کپڑا بھی اس میں شامل ہے۔ چنانچہ یہ جواب سن کر سوال کرنے والے نے اسی مجلس میں اپنا اعتراض واپس لے لیا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ ہمیشہ حضرت عمرؓ کے عدل وانصاف کے اظہار کے لیے پیش کیا جاتا ہے، لیکن اس ممتحن نے ادھورا واقعہ لکھ کر اسے جس طرح سوال کی شکل دی ہے اور اس میں سے ’’عدل کی خرابی‘‘ اور ’’نا اہلی‘‘ کا طعنہ کشید کرنے کی کوشش کی ہے وہ انتہائی افسوسناک طریق کار ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی صاحب مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی معرکۃ آلارا نظم ’’شِکوہ، جوابِ شِکوہ‘‘ میں سے صرف شِکوہ کو نقل کر کے اس پر اظہارِ خیال کریں اور اس بنیاد پر علامہ اقبالؒ کے بارے میں اس قسم کے ریمارکس دینا شروع کر دیں جیسے ریمارکس یہ سوال مرتب کرنے والے ممتحن نے سیدنا حضرت عمرؓ کے بارے میں قائم کرنے کی افسوسناک حرکت کی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پرچہ مرتب کرنے والا ممتحن یا تو بالکل جاہلِ مطلق ہے جسے پورے واقعہ کا سرے سے علم نہیں ہے، یا انتہائی درجے کا بد دیانت شخص ہے جس نے جان بوجھ کر ادھورا واقعہ نقل کر کے اسے امیر المؤمنین حضرت عمرؓ جیسی بلند وبالا شخصیت پر طعنہ زنی کا بہانہ بنایا ہے۔

پھر فنی لحاظ سے بھی یہ سوال انتہائی احمقانہ ہے کہ اشعار میں حضرت عمرؓ کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے مگر اس پر یہ ضمنی سوال پوچھا جا رہا ہے کہ یہ کس خلیفہ کے بارے میں ہے؟ جبکہ یہ بھی بتایا جاتا ہے

کہ اردو کے جس نصاب میں سے یہ امتحانی سوالات مرتب کیے گئے ہیں اس میں سرے سے یہ واقعہ مذکور ہی نہیں ہے۔

ہم اس افسوسناک حرکت کی طرف حکومت پنجاب کو توجہ دلاتے ہوئے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کی انکوائری کرائی جائے اور ملتِ اسلامیہ کی محبوب ترین شخصیت سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں اس قسم کے احمقانہ سوالات امتحانی پرچے میں شامل کرنے والے ممتحن اور اس کی منظوری دینے والے افسران کے خلاف کاروائی کی جائے۔

حج کا نظم ونسق اور فقہی ترجیحات

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۵ء)

...... یہ بات منطقی اور اصولی ہے کہ حج کے انتظامات کرنے والی اتھارٹی اپنے فقہی مسلک اور ترجیحات کے مطابق ہی انتظامات کرے گی۔ حج کے انتظامات اور حرمین شریفین کے نظم وکنٹرول کے لیے مختلف ممالک کے نمائندوں پر مشتمل کسی مشترکہ اتھارٹی کے قیام کی تجویز بظاہر کتنی دل فریب اور خوبصورت کیوں نہ ہو، وہ عملی اعتبار سے اسی درجہ میں ناقابلِ عمل ہوگی۔ اس لیے کہ مختلف ممالک کی سیاسی ترجیحات کا ٹکراؤ اپنی جگہ، فقہی اور مسلکی ترجیحات کا اتار چڑھاؤ بھی خلفشار اور افراتفری کا ماحول پیدا کرنے میں کم کردار ادا نہیں کرے گا۔ اور خدانخواستہ ایسا کرنے سے اس وقت دنیا بھر کے حجاج اور معتمرین سال بھر جس سکون اور اطمینان کے ماحول میں مناسک حج وعمرہ ادا کرتے ہیں وہ نعوذ باللہ قصہ پارینہ بن کر رہ جائے گا۔ اس لیے کہ مختلف ممالک کے نمائندے یقیناً مختلف فقہی مسالک کے حامل ہوں گے، اس لیے مناسک حج و عمرہ کے انتظامات کے بارے میں مختلف فقہی ترجیحات کو باہم ایڈجسٹ کرنے کے لیے یا تو انہیں اپنی فقہی ترجیحات سے دستبردار ہو کر کوئی مشترکہ فقہی ڈھانچہ از سرِ نو تشکیل دینا ہوگا، جیسا کہ علامہ محمد اقبالؒ عمومی معاشرتی ماحول میں فقہ کی تشکیلِ جدید کی تجویز دے چکے ہیں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے اور اپنی اپنی فقہی ترجیحات کی طرف معاملات کو لے جانے کے لیے فکر مند ہوں گے تو حاجیوں کو پریشانی میں مبتلا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔

اس لیے قابلِ عمل اور منطقی بات یہی ہے کہ انتظامات کا کنٹرول ایک ہاتھ میں ہو اور یہ سعودی عرب کا حق بنتا ہے کہ سعودی آبادی کی اکثریت کے فقہی مسلک اور ریاستی فقہی مذہب کی بنیاد پر انتظامات کا بنیادی ڈھانچہ تشکیل دے۔ سعودی آبادی کی اکثریت حنبلی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور ریاست کا فقہی مذہب بھی حنبلی ہے۔ حنبلی مذہب امام اہلِ سنت حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی تعبیرات وتشریحات کے مطابق تشکیل پایا ہے جو ائمہ اہلِ سنت میں عظیم المرتبت امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ سعودی حکومت سے یہ گزارش کرنے کی ضرورت ہے کہ دوسرے فقہی مذاہب کے جید علماء کرام کے

ساتھ مشاورت اور انہیں اعتماد میں لینے کی کوئی صورت ضرور نکالی جائے تاکہ باہم فقہی ہم آہنگی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جاسکے اور حج وعمرہ کے لیے دنیا کے کونے کونے سے آنے والوں کے فقہی رجحانات کو بہتر انداز میں ایڈجسٹ کیا جاسکے۔......

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جولائی ۲۰۱۶ء)

......حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی کو قرآن کریم کے اعجاز کا ایک بڑا پہلو اور جدید دور کی اہم ضرورت قرار دیا تھا، اور شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے بھی اسلام کی تجدید اور فقہ وشریعت کی تشکیلِ نو کا ہدف یہی بیان کیا ہے۔ مگر ہماری جدید دانش مروجہ فکر وفلسفہ کا رخ اسلام کی طرف موڑنے کی کوشش کرنے کی بجائے اسلام کو اس تھکے ماندہ فکر وفلسفہ کے بوسیدہ سانچے میں فٹ کرنے میں اپنی صلاحیتوں کو صَرف کرنے میں مصروف ہے۔ اس تناظر میں وہ اربابِ فکر ودانش ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں جو مسلم دانش کو اس دلدل سے نجات دلانے اور قرآن وسنت کی حقیقی شاہراہ کی طرف واپس لانے کی تگ ودو کر رہے ہیں۔ اور یقیناً مستقبل میں انہی اصحابِ فکر ودانش کی یہ مبارک مساعی فکری وعلمی معاملات کو صحیح رخ پر گامزن کرنے کی جدوجہد کا نقشِ اول قرار پائیں گی۔......

حضرت مجدد الف ثانیؒ

(یومِ آزادی ۱۴ اگست ۲۰۲۲ء کے موقع پر مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جمعیۃ طلباء اسلام اور خلافتِ راشدہ اسٹڈی سنٹر کے زیراہتمام ایک تقریب میں خطاب سے اقتباس)

...... ایک ہتھیاروں کی جنگ ہوتی ہے، ایک علم وفکر کی جنگ ہوتی ہے، اور ایک دانش و تدبر کی جنگ ہوتی ہے۔ ہر جنگ کا اپنا موقع ہوتا ہے۔ جب ہتھیاروں کی جنگ کا موقع ہو تو ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کی جاتی ہے، اور جب علم وفکر کی جنگ کا موقع ہو تو وہ جنگ بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہ موقع محل کے مطابق ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کو علم، فکر، دانش، حکمت کی جنگ درپیش تھی، اس کو لابنگ کہا جاتا ہے کہ سامنے آنے کی بجائے ایک ایک فرد پر محنت کی جائے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر بادشاہ کے بعد جب اس کا جانشین جہانگیر تخت پر بیٹھا تو اس کا پہلا دور اپنے باپ اکبر کے ساتھ تھا، لیکن اس کی زندگی کا آخری دور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ساتھ تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی محنت کا یہ خلاصہ ہے کہ اکبر کے سارے فلسفے کو جہانگیر نے الٹ کر رکھ دیا تھا، جس کے پیچھے حضرت مجدد الف ثانی کی محنت کارفرما تھی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی محنت کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ ہم نے اپنا مذہب، دین، عقیدہ، تہذیب و تمدن، ثقافت و روایات اور تہذیبی تشخص قائم رکھنا ہے، اسے خلط ملط نہیں ہونے دینا، اور وہ اس تحریک میں کامیاب رہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تعارف میں علامہ محمد اقبالؒ کا ایک شعر ہی کافی ہے ۔

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان

نوٹس

۲۲ اپریل ۲۰۲۰ء

آج اکیس اپریل ہے، شاعرِ مشرق و مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ کا یومِ وفات، جو ہمارے قومی محسن ہیں۔ مگر ہم شاید اس لیے ان کو بھول جانے کی کوشش کر رہے کہ وہ خدا کا نام لیتے تھے اور محبتِ رسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم کا درس دیتے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں، آمین۔

۳۰ اپریل ۲۰۲۰ء

قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ وہ یہودیت کا چربہ ہے۔ جس کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ ریاستی اداروں کی کمین گاہوں میں بیٹھ کر خفیہ کاروائیوں کا طریق کار رکھتے ہیں، جبکہ سیکولر لابیوں کی تکنیک بھی یہی ہے جو اہلِ دین کے لیے لمحۂ فکریہ ہے، اللہ تعالیٰ راہِ حق میں استقامت دیں، آمین۔

۱۳ مئی ۲۰۲۱ء

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے "کل یوم لایعصی اللّٰہ فیہ عزوجل فھولنا عید" جو دن اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے بغیر گزر جائے وہ ہمارے لیے عید کا دن ہے۔ علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کا کہنا ہے "عیدِ آزاداں شکوہِ ملک ودیں" آزاد لوگوں کی عید ملک اور دین کے وقار و رعب میں ہے۔

۳۰ مئی ۲۰۲۱ء

پاسپورٹ میں مذہب کے خانے کا اضافہ چار عشرے قبل قادیانی پس منظر میں کیا گیا تھا جب منتخب پارلیمنٹ نے بحث وتمحیص اور قادیانی راہنماؤں کو صفائی کا موقع دینے کے بعد مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی اس تجویز کو دستوری حیثیت دی تھی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ امت شمار کیا جائے۔

٦ مارچ ۲۰۲۲ء

علامہ محمد اقبال مرحوم اس اعتبار سے ماضی قریب کے خوش قسمت ترین راہنما ہیں کہ انہیں کم و

بیش تمام طبقوں سے یکساں احترام ملا ہے۔ اور ان کا یہ کارنامہ تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے کہ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں مدت سے پرورش پانے والے جذبات کو ایک واضح فکر کا رخ دیا۔

۱۴ جون ۲۰۲۲ء

برصغیر پر تاجِ برطانیہ کے قبضہ کے بعد عوامی سطح پر دینی مدارس کے اس نظام کا آغاز اس خوف کی بنا پر ہوا تھا کہ اگر دینی علوم کی تعلیم و تدریس کا انتظام نہ ہو سکا تو یہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی زندگی سے نکل جائیں گے اور علامہ محمد اقبالؒ کے بقول یہ خطہ بھی اسپین بن جائے گا۔

۱۳ جون ۲۰۲۳ء

علامہ محمد اقبالؒ کے بعد مغربی فلسفہ و ثقافت کا اس سطح پر ناقدانہ جائزہ لینے والا اور کوئی مفکر سامنے نہیں آیا اور اس سے بڑا المیہ یہ کہ خود اقبال کے بعض نام لیوا اس معاملہ میں اقبال کی راہ پر چلنے کی بجائے مغربی فلسفہ و ثقافت کی نام نہاد علمی برتری کے سامنے سر بسجود دکھائی دیتے ہیں۔

۱۴ جون ۲۰۲۳ء

مغربی جمہوریت جس میں علامہ محمد اقبال کے بقول ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے'' اپنی تمام تر خوبیوں و خامیوں کے ساتھ اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اس کے نفع و نقصان کے تناسب کا اندازہ کرنا اب مشکل نہیں رہا اور اس کے مداح بھی بسا اوقات اس کی فریب کاریوں کا تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں۔